www.Paksociety.com

گئیں، میں کافی دور تک اپنی نگاہوں سے ان کا تعاقب کرتا رہا ایک نامعلوم سا احساس میرے وجود کو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

کوئی چالیس گز دور جا کر ان خاتون نے وہیل چیئر کا رخ واپس موڑا تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اب مجھے وہ نظر آ رہی تھی۔ وہ اب بھی ناول میں گم تھی، اس کی امی کی زبان ابھی تک چل رہی تھی۔

نجانے کتنی ہی دیر میں اسے یوں دیکھتا رہا۔

میں نے اس کی امی نما خاتون کو جھک کر اسے کچھ کہتے دیکھا، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی امی نے وہیل چیئر وہیں روکی اور روش پر چلتی ہوئی، دور کھڑی ایک ماڈرن خاتون کی جانب بڑھ گئیں۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا وہ ابھی تک ناول میں سر دیے بیٹھی تھی۔ جیسے اسے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

میں نے دوبارہ اس کی امی کو دیکھا وہ ان خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں، میں ٹہلتا ہوا ان کے قریب چلا گیا اور کان ان کی باتوں کی طرف لگا دیے۔

"مسز جہانگیر! آپ ہمارے ساتھ چلیں نا، میرے ڈیزائنر کے آؤٹ لٹ پر۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مسز نصیر، مگر میری بیٹی۔" مسز جہانگیر کا تذبذب رسمی سا تھا۔

"کوئی بات نہیں میڈ کو کہہ دیجئے گا۔ وہیں outlet سے فون کر دیجئے گا۔ ابھی تو آپ چلیں نا" مسز نصیر، مسز جہانگیر کو اپنے ساتھ لے کر پارک سے باہر چلی گئیں۔

مجھے اس حرکت پر بہت غصہ آیا تھا یوں اپنی بیٹی کو پارک میں تنہا چھوڑ جانا کہاں کا انصاف تھا۔ اس کو تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی امی اس کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ وہ تو ناول میں گم تھی۔

ناول میں مگن اس لڑکی کو نہایت خوش اخلاقی اور شائستگی سے کہنے کہ اس کی والدہ جا چکی ہیں اور اپنی وہیل چیئر روش سے ہٹا کر سائیڈ پر کر لے، میں اپنے جگہ سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی جانب بڑھا، کال سینٹر پر جاب کرنے کے بعد مجھے ہر طرح کے لوگوں سے ڈیل کرنے کا طریقہ آ گیا تھا۔ میرے اس کے اور اس کی والدہ کے معاملے میں مداخلت پر وہ زیادہ سے زیادہ برا بھلا ہی کہہ دے گی تو کہہ دے۔ میں بس آرام سے سر ہلا کر واپس آ جاؤں گا۔

اس کے عقب میں پہنچ کر میں نے دھیرے سے "ایکسکیوزمی" کہا۔

وہ ناول کو ہی پڑھتی رہی۔ اس نے شاید میری بات نہیں سنی تھی۔

میں نے گلا کھنکھار کر اس کو متوجہ کرنا چاہا جواب ندارد۔

اس سے پہلے کہ میں کسی مشکل میں پھنس جاؤں یا اس کی اماں حضور واپس آ جائیں، میں نے تھوڑا سا بہادر بننے کا فیصلہ کر لیا۔ کون سی قیامت آ جائے گی اگر میں خود ہی اس کی بیساکھی کو دھکیل کر ایک طرف کھڑا کروں خوامخواہ ہی روش کے عین وسط میں اس کی وہیل چیئر نہایت آکورڈ لگ رہی تھی۔

میں نے عقب سے وہیل چیئر تھام لی اور اسے تھوڑا آگے کو دھکیلا۔ یکبارگی میری ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی اگر اس نے گھبرا کر شور مچا دیا تو؟

مگر اس کو پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ میں اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ایک طرف لانے کے بجائے روش پر چلنے لگا۔ اس لڑکی نے سر نہ اٹھایا۔ وہ کتاب میں ہی گم بیٹھی رہی۔ اپنے بعد کسی اور کو میں نے اتنے جنون اور عشق سے مطالعہ میں غرق ہوتے پہلے دفعہ دیکھا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔

میں کافی دیر تک اس کی وہیل چیئر کو چلاتا رہا۔ ہم پارک کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں ایک انجان سی سڑک پر اس کی وہیل چیئر کے ساتھ موجود تھا دونوں اطراف میں وسیع و عریض بنگلوز موجود تھے۔ یہ جگہ پارک سے قریب ہی تھی میں نے واپس مڑنے کا فیصلہ کیا، مگر کچھ ہی دور ایک گاڑی رکی تھی اس سے باہر نکلنے والی مسز نصیر اور مسز جہانگیر تھیں۔ شاید وہ مسز نصیر کا گھر تھا۔ وہ دونوں کھڑی باتوں میں مشغول تھیں۔

اس سے پہلے کہ مسز جہانگیر ادھر ہی آ جائیں، اور مجھ پر اغوا یا حدود کا پرچہ کٹا دیں، نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کی وہیل چیئر کو وہیں روک دیا اور خود آرام سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس تمام عرصے میں اس لڑکی نے سر نہیں اٹھایا تھا۔

وہ خاتون ابھی تک اپنی سہیلی سے گپوں میں مگن تھیں۔ اچانک ہی جیسے اس لڑکی کو ہوش سا آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

اس نے شانے اچکا دیے۔ اس کے اس انداز میں اتنی

معصومیت اور بے ساختہ پن تھا کہ بے اختیار میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔

وہ اپنی وہیل چیئر خود ہی گھسیٹتی آگے لے گئی۔

میں ساری رات اسے سوچتا رہا اس کی یاد مجھے کچھ اور کرنے ہی نہ دے رہی تھی۔ آج تو مجھ سے کوئی کتاب بھی نہ پڑھی جا رہی تھی۔ ایک بہت نیا سا جذبہ میرے دل میں نمو پا رہا تھا۔ وہ احساس میری رگوں میں دوڑتے لہو کی طرح گرم، اور تپتے صحرا میں نخلستان کی مانند ٹھنڈا تھا بیک وقت مجھے بے چینی اور راحت محسوس ہو رہی تھی۔

جنوری کی یخ بستہ شب کے تیسرے پہر، خرم زید پر یہ ادراک ہوا تھا کہ اسے اس لڑکی سے، جو بہت خوب صورت تو نہ تھی، جس کو اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، جس کا نام تک اسے معلوم نہ تھا اس لڑکی نے اس کو محبت ہو گئی تھی۔

تمام دن میں دل ہی دل میں اس کے شام کو پارک آ جانے کی دعا کرتا رہا میں ایسا کیوں چاہتا تھا، مجھے نہیں معلوم، بس میری خواہش تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھوں۔

میں گھنٹہ بھر پارک میں نہایت بے چینی کے عالم میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی، مگر میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور وہیں بیٹھا رہا۔ بالآخر وہ اپنی نوکرانی کے ہمراہ آتی دکھائی دی اس کی گود میں کتاب رکھی تھی۔

ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس کی نوکرانی نے وہیل چیئر روک دی اور غالباً اس کی ہدایت پر اسے وہاں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ لڑکی کافی دیر تک وہاں بیٹھی ادھر ادھر دیکھتی رہی جبکہ میں اس سوچ میں غلطاں رہا کہ اس کے پاس جا کر کیا کہوں؟ کس طرح اپنے احساسات اس تک پہنچاؤں؟

"ہیلو مس نامعلوم! میں نے کل آپ کو پارک میں دیکھا اور مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا۔ میں دوڑتے قدموں کے ساتھ پارک سے نکلا میری جیب میں کوئی بڑا گلدستہ خریدنے کی رقم تو نہ تھی، البتہ ایک پھول خرید جا سکتا تھا۔ ایک سفید پھول خرید کر اسی رفتار سے بھاگتا ہوا میں پارک میں واپس پہنچا شکر ہے وہ وہیں تھی میں نے اشارے سے قریب کھیلتے دانیال کو بلایا اور تاکید کی۔

"جاؤ، یہ پھول اس لڑکی کو دے آؤ۔ اگر پوچھے کہ کس نے دیا ہے تو کہہ دینا انہوں نے بتانے سے منع کیا ہے۔"

اس نے فوراً "میرے حکم کی تکمیل کی۔

ہاتھ میں سفید گلاب پکڑے وہ معصوم سی لڑکی مسکرا رہی تھی۔ یعنی اسے برا نہیں لگا تھا۔ ایک تسلی بخش احساس میرے پورے وجود پر پھیل گیا۔

اس روز کے بعد یہ معمول بن گیا تھا۔ وہ روز شام کو پارک آتی اور میں بچوں کے ہاتھ اسے پھول بھجوا دیتا۔ یہ معمول تین ہفتہ جاری رہ سکا۔ اچانک ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابا جنہوں نے ہمیشہ مجھے ڈانٹا مارا، کبھی میری حوصلہ افزائی نہ کی، پیار کرنا تو دور کی بات، کبھی پیار سے پکارا تک نہیں، میری پڑھائی کی مخالفت کی، اماں کو ہمیشہ جھڑکا، بہنوں پر بے جا روک ٹوک کی، ہاں وہی ابا جن سے اماں نے تمام عمر وفا کی، جن کی ہمیشہ بہنوں نے خدمت کی، کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دی، ہمیشہ ان کی مرضی پر چلیں، ان کا حکم نہ ٹالا، وہی ابا جن سے لاکھ اختلافات ہونے کے باوجود میں نے بہت محبت کی تھی

پھر کتنے ڈھیر سارے دن اماں کو تسلی اور بہنوں کو دلاسا دیتے ہوئے گزرے، میرے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی تھی، مجھے اب گھر کو سنبھالنا تھا۔

پھر اچانک ایک دن اس انجان لڑکی کا فون آ گیا۔ اس نے پارک میں آنے والے بچوں کی مدد سے مجھے ٹریس کیا تھا۔

اس کا نام سمل تھا سمل جہانگیر۔

☆ ☆ ☆

میرا ڈیوٹی کا ٹائم پورا ہو چکا تھا، میں سیٹ سے اٹھا اور عماد کے روم تک چلا آیا۔

"میرا خیال ہے میں اپنی ڈیوٹی کر چکا ہوں۔" میرے کہنے پر اس نے سر ہلا کر دراز سے دس دس پاؤنڈز کے تین نوٹ نکال کر مجھے تھمائے۔ میں شکریہ ادا کر کے جانے ہی لگا تھا کہ اس نے مجھے پیچھے سے پکارا۔

"کھرم؟" وہ شاید خ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر اس کو دیکھا وہ پہلے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا "تم بیکھم کے کچھ لگتے تو نہیں ہو؟"

"کون بیکھم؟"

"ڈیوڈ بیکھم۔"

www.Paksociety.com

"وہ فٹ بالر جو مانچسٹر یونائیٹڈ کے لیے کھیلتا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"نہیں تو کیوں؟"

"تمہاری شکل اس سے بہت ملتی ہے۔"

"اوہ..... اچھا؟" مجھے حیرانی ہوئی۔

ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر صاحب اندر داخل ہوئے۔ عماد ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہوا اس نے انہیں سلام کر کے میرا تعارف کرایا۔

وہ بلال احمد تھے۔ عماد کے چچا اور صفوان کے والد، صفوان عماد کا کزن تھا۔

بلال احمد نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ اگلے آدھے گھنٹے تک میرا انٹرویو کرتے رہے۔ جب وہ جانے لگے تو انہوں نے مجھے وینس برج ہوٹل آنے کو کہا۔ یہ بھی ان ہی کا ہوٹل تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے عماد کو خدا حافظ کہا تو وہ بولا۔ "بی کیئر فل خرم..... انکل کسی اجنبی شخص کو یوں نہیں بلاتے۔"

"کیا مطلب؟"

"ان کے پاس سوچ بورڈ پر کوئی نہیں ہوتا جو لڑکی پہلے ہوتی تھی، وہ اپنی ماں کے پاس بریڈ فورڈ چلی گئی ہے۔ میرے خیال میں وہ تمہیں جاب دینا چاہتے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہاں سے نکل آیا۔

ویٹ وڈ اسٹریٹ میں گھلتے ہوئے مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں سمل کے بلانے پر اس کے گھر گیا تھا۔ اس روز 17 مارچ تھی۔ آج سے دو ماہ اور تین دن پہلے۔

☆ ☆ ☆

وہ میری طرح تھی۔ بالکل میرے جیسی، بچپن سے جوانی تک محروم رہی تھی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا اس سے کسی کو محبت نہ تھی سب نے میری طرح اس کو کوئی فالتو شے سمجھ کر ہمیشہ نظر انداز کیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی الگ تھلگ رہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی میں تنہائی تھی جسے ختم کرنے کے لیے وہ کتابوں کا سہارا لیتی تھی۔

جس طرح مجھے اپنی غربت کا کمپلیکس تھا، اسی طرح اسے اپنی معمولی شکل و صورت سے بہت سبکی اٹھانا پڑتی تھی۔ میں سو نہیں سکتا تھا تو وہ چل نہیں سکتی تھی۔ بالکل میری طرح وہ بہت زیادہ تنہا تھی۔

جب وہ مجھے ملی تو مجھے لگا کہ جیسے مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی ہو۔ وہ خدا کی طرف سے میری زندگی کا سب سے بڑا اور خوب صورت تحفہ تھی۔

اس شام، جھیل کے کنارے اس نے مجھے اپنے خواب بتائے تھے۔ اس کی خواہشات بہت معصومانہ تھیں۔ وہ بھی میری طرح خوابوں پر یقین رکھتی تھی گو کہ اس کے باپ کے پاس موجود دولت اسے کسی خوب صورت جزیرے پر ایک کیا دس گھر لے کر دے سکتی تھی مگر اس کی خواہش تھی کہ اسے یہ سب کچھ کوئی اور لے کر دے۔ کوئی ایسا شخص جو اس کو چاہتا ہو تب میں نے اس سے کہا تھا۔

"سمل! اگر میں تمہارے خواب پورے کر دوں تو کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ ساری عمر میرے ساتھ رہو گی؟"

اس نے کچھ حیرت سے میری جانب دیکھا۔

"کیوں؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟"

اس کے چہرے پر ایک دم ہی ایسی رونق آ گئی تھی کہ مجھے لگا میری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ مجھے لگا ہر جگہ خوب صورتی بکھر گئی ہو۔ ہر پودے کی ٹہنی پر، ہر ٹہنی پر، ہر کونپل کے شگوفے پر، ہر پھول کی پتی پر، گھاس کی چومتی ہوئی شبنم پر، جھیل کے گہرے پانیوں اور بادلوں کی اوٹ سے جھانکتی قوس قزح کے سارے رنگوں پر ہر جگہ خوب صورتی تھی۔

جب شام کے ملگجے سائے ہر سو پھیل رہے تھے، پرندوں کی چہچہاہٹ میں فضا میں گونج رہی تھی، جھیل کے پانی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا، اس لمحے اس نے کہا تھا۔

"مجھے تمہاری آنکھوں میں اپنے نام کے دیے نظر آتے ہیں خرم! میں اسی روشنی میں اپنے خواب ڈھونڈنا چاہتی ہوں، بس ان جگنوؤں کو کسی تاریک رستے پر آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا، انہیں کھونا مت، ورنہ خواب مٹی میں مل جاتے ہیں اور مجھے اپنے خوابوں سے بہت محبت ہے۔"

میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ دبایا "مجھ سے شادی کرو گی؟"

"سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ مجھے چھیڑنے لگی۔

"ٹھیک ہے سوچ لو، خوب سوچ لو۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کس سخی سے پالا پڑا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دو روز بعد کی بات ہے، اس نے مجھے فون کر کے اپنے گھر بلوایا۔ اس کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ

ہے۔ ویسے بھی گڑبڑ کرانے کو ماہ نور اس گھر میں موجود تھی۔ ماہ نور جہانگیر جس سے مجھے شدید نفرت تھی۔

اس کے گھر آ کر ہمیشہ بہت الجھن ہوتی تھی۔ مجھے اپنی انا بہت عزیز تھی۔ مجھے اس کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے میں اس تمام عرصے میں محض دو بار ہی "جہانگیر پیلس" آیا تھا۔

اس روز تیسری دفعہ اس محل نما گھر میں داخل ہوتے ہوئے مجھے پہلی بار بہت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

"میں تم سے شادی پر تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔" سمل نے کہا تھا۔

"کیسی شرط؟" اس کے لہجے میں الجھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"میری شرط یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہوں گی....."

اس نے بات کا آغاز کیا۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔ اس نے میرے گھر میں ہی رہنا تھا۔ وہ تو ایسے کہہ رہی تھی جیسے ہم نے وائٹ ہاؤس میں بسیرا کرنا ہو۔

"میرا مطلب ہے میں ڈیڈ کی دولت میں سے ایک روپیہ بھی نہیں لوں گی نہ ہی کسی قسم کا جہیز لوں گی۔ میرے حصے کی دولت میرے ڈیڈ کے پاس ہی رہے گی اور میرے مرنے کے بعد وہ ایک ٹرسٹ کے نام ہو جائے گی۔ میں تمہارے ساتھ تمہاری غربت میں گزارا کرنے کو تیار ہوں، لیکن جس طرح ڈیڈ کی جائیداد پر میرا کوئی حق نہیں، اسی طرح تمہارا بھی کوئی حق نہیں ہو گا میں تمام عمر تمہارے چھوٹے سے گھر میں گزارا کرنے کو تیار ہوں خرم زید! اگر تمہیں میری شرط منظور ہے تو بتاؤ۔"

اس کی نگاہوں میں اپنی حیثیت کا اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا۔ میں ایک ایسا غریب لڑکا تھا جس کا کوئی مستقبل نہ تھا تب ہی اس نے "تمام عمر" والے الفاظ استعمال کیے تھے اور اس کے نزدیک میں غریب تھا اور غریب ہی رہوں گا۔ اس نے مجھ سے میرے مسائل شیئر کرنے کی بات نہ کی تھی "تمہاری غربت" کہا تھا وہ ان مسائل میں رہنا چاہتی تھی جن کو میں چھوڑنا چاہتا تھا میں ہمیشہ ایسا نہیں رہوں گا، یہ بات مجھے اس وقت سے معلوم تھی جب میں محض بارہ برس کا تھا۔ یہ بات میں اسے کئی دفعہ بتا چکا تھا کہ مجھے اس کے والد کی کوئی مدد نہیں چاہیے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے والد سے کہہ کر مجھے جاب دلانے کی بات کی تھی مگر میں نے ایسی وقت انکار کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے میں کوئی لالچی یا خود غرض انسان ہوں جسے اس کے بجائے اس کی دولت سے دلچسپی ہو۔ اگر اس کو میری ان باتوں کا یقین نہیں آیا تو بھلا میری محبت کا کہاں آیا ہو گا؟ مجھے معلوم تھا اس کو بلکہ شیخ جہانگیر کو بھی میں hunter fortune ہی لگوں گا۔ میری حیثیت ان کے برابر نہ تھی۔ ان کو میری بات کا یقین اس وقت آئے گا جب میں ان کے برابر پہنچوں گا۔

میرے پاس اس وقت دو راستے تھے۔ ایک آسان راستہ جس پر چل کر میں آسانی سے سمل سے شادی کر کے لالچی کا طوق گلے میں پہن لوں اور ایک اور راستہ بھی تھا کہ میں اپنے ہاتھوں سے کما کر ان کے برابر پہنچوں اور پھر عزت سے اس کا ہاتھ مانگوں دوسرا راستہ طویل اور کٹھن تھا۔ مگر میں نے اس کا انتخاب کیا۔

میں نے کوئی دلیل نہ دی، کوئی صفائی پیش نہ کی، کیونکہ سچ کو دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ صفائیاں پیش نہیں کرتے۔

میں نے اسے الوداع کہا اور واپس آ گیا اگر اس وقت میں اسے کچھ کہتا بھی تو وہ میری بات نہ مانتی۔

میں نے اس روز اپنے اکاؤنٹ میں موجود رقم چیک کی میری پڑھائی پر پہلے ہی بہت کچھ خرچ ہو گیا تھا میرے اکاؤنٹ میں پندرہ ہزار سے زیادہ نہ تھے لیکن مجھے اسی پندرہ ہزار سے ۱۵۵ ہوٹلز بنانے تھے۔

میں ترقی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت سوچا اور انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یارک شائر میں پاکستانی کمیونٹی بہت بڑی تعداد میں قیام پذیر ہے۔ اسی لیے میں وہاں آیا تھا۔ مجھے وہاں ایک کمرے میں چار لڑکوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔

قریباً ایک ہفتہ میں ادھر رہا۔ چار روز میں نے ایک پیٹرول پمپ میں نوکری بھی کی، بریڈ فورڈ میں ایک پاکستانی فیملی کا ویر ہاؤس تھا میں نے ایسے ہی ان کے متعلق پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ ان کے لیڈز میں کچھ ہوٹلز ہیں۔ کچھ سوچ کر میں وہاں آ گیا گو کہ مجھے کہیں اور بھی کوئی جاب مل جاتی مگر میں نے اس پاکستانی فیملی کا ہی انتخاب کیا سب سے پہلے میں نے اولڈ وکریج (یہ ان ہی کا ایک ہوٹل تھا) کے کیون ملر سے دوستی گانٹھی، اس کے اپارٹمنٹ میں آدھا کرایہ دے کر رہنے لگا، حالانکہ وہاں اپارٹمنٹس کے کرایے

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at

0336-5557121

آسمان کو چھو رہے ہوتے ہیں اکثر دس دس لڑکے دو کمروں کے گھر میں گزارا کرتے ہیں مگر میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے کیون مل گیا۔ پھر میں نے اس سے جھوٹ بلوایا۔ وہ شادی شدہ نہیں تھا۔ اس نے عماد کو یہ کہہ کر کہ میری فیانسی کی ممی آرہی ہیں، چھٹی مانگ لی مجھے چار گھنٹے کے لیے ڈیسک کلرک بننے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے عماد اور اس کے والد و چچاؤں سے تعارف چاہیے تھا، جو مجھے بالآخر مل ہی گیا۔

مورے میں واقع بلال احمد کے ہوٹل وینس برج پر میں اگلے روز ہی چلا گیا۔ قریباً" آدھے گھنٹے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد مجھے ان تک رسائی حاصل ہوئی۔

بلال صاحب کا آفس خاصا وسیع و عریض اور رویل فرنشڈ تھا۔ فل سائز کھڑکیوں کے آگے سرمئی رنگ کے پردے نہایت نفاست سے برابر کیے گئے تھے۔ اس اٹالین طرز کے آفس کو دیکھ کر میرے ذہن کے پردے پر ایک دھندلی سی شبیہہ ابھری جس کو میں پہچان نہ سکا۔

"آؤ..... بیٹھو۔" انہوں نے کھڑے ہو کر میرے ساتھ مصافحہ کیا میں ان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"چائے یا کافی؟" چائے غالباً" انہوں نے میرے پاکستانی ہونے کی وجہ سے پوچھی تھی۔

"کافی بلیک۔" میرے کہنے پر انہوں نے ایک کریم کافی اور ایک بلیک کافی کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد وہ پوری توجہ سے میری جانب متوجہ ہوئے "تو مسٹر زید تم کیا کرنا جانتے ہو؟"

"میں تو ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ بھی چلا سکتا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کے پاس میرے لیے کیا آفر ہے؟" میں نے نہایت خود اعتمادی سے کہا۔

"میں تمہیں وینس برج پر جاب دینا چاہتا ہوں۔ تم ہوٹل میں کیا کیا کر سکتے ہو۔" اب کی بار وہ زور دے کر بولے۔

"میں بیل بوائے ویٹر، ڈیسک کلرک، ریسپشنسٹ، چوکیدار، شیف، ڈیوٹی منیجر اور جنرل منیجر تک سب بن سکتا ہوں۔"

"میڈ ہی بچی ہیں وہ بھی کہہ دیتے۔" ان کے کہنے پر میں ہنس پڑا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"خرم! اس شہر میں ہزاروں نوکری کی تلاش میں ہیں سب کی خواہش ہے کہ ان کو اچھی نوکری ملے۔ ان میں سے کئی ہمارے ہوٹلز کا چکر بھی لگا چکے ہیں، مگر جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

وہ ایک لمحے کو رکے تھے۔ دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کھلا تھا۔ ملازم کافی کے دو کپ لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

"اس دن جب میں تم سے پہلی دفعہ ملا تھا تو مجھے لگا تھا تم ذہین ہو۔ تمہاری آنکھوں میں ایک ایسی چمک ہے جو بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں، میں نے دیکھی ہے۔ تم نے اس روز کہا تھا تمہیں کامیابی کے لیے شارٹ کٹ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ کامیابی کے لیے شارٹ کٹس ہوتے بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک رستہ ہوتا ہے، محنت، ذہانت اور تھوڑی سی لک کا۔"

"تھوڑی سی لک؟"

"ہاں باقی سب کچھ اپنے دماغ اور ہاتھوں سے حاصل کرنا سیکھو۔"

یہ نصیحت اگر کبھی ابا نے کی ہوتی تو میں کتنا خوش ہوتا۔

"تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھ سکتے ہو۔"

"لیکن مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے مجھے تکتے رہے، پھر بولے۔

"چلو تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھ لو۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تمہارا گول کیا ہے۔ کل تم نے کہا تھا تم دنیا فتح کرنا چاہتے ہو کیسے؟"

"میں چاہتا ہوں میں ۱۵۵ ہوٹلز کی ایک چین بناؤں۔ میں اس بزنس کو تسخیر کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے یہ بات سہل سے بھی کہی تھی، مگر شاید اس نے یقین نہ کیا تھا۔

"اس کے لیے بہت پیسہ چاہیے۔" ان کی بات سن کر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ صرف ذہانت اور محنت چاہیے۔"

"ذہانت رکھتے ہو ینگ مین؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں میں نے بھی محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"جی؟" میں نے حیران سا ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ انہوں نے جواب میں میری انگلی کی جانب اشارہ کیا۔ جس

www.Paksociety.com

میں نے پریڈ فورڈ سے ایک آرٹیفیشل سلور انگوٹھی
ید کر پہنی تھی۔
میں نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔ "یہ نقلی ہے۔"
ی سمجھ میں آیا تھا یا نہیں' انہوں نے بس سر ہلا دیا۔
وہ اپنی نشست سے اٹھے آہستہ ـــــ قدموں
ے چلتے ہوئے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے آگے بڑھ
انہوں نے فل سائز کھڑکیوں کے سامنے سے پردے
کائے۔ شام کی نیلگوں روشنی اندر آنے لگی۔ انہوں
نے میری جانب دیکھا اور مدھم آواز میں بولے۔
"ہوٹل مینجمنٹ دنیا کا سب سے گلیمرس بزنس ہے۔
ں میں پیسہ ہے' مواقع ہیں' چارم ہے۔ آپ روز ایشیا
ے افریقہ اور امریکہ سے آسٹریلیا تک ہر خطے کے لوگ
ھتے ہیں' ان کے بارے میں جانتے ہیں' بڑے بڑے
سینارز' کانفرنسیں' پارٹیز' فنکشنز' اہم بزنس میٹنگز'
ب ہوٹلز میں ہوتا ہے۔"
"لیکن اس کام میں ایک ڈرا بیک بھی ہے۔ آپ کو ٹائم
ت لگانا پڑتا ہے۔ یہ کوئی نائن ٹو فائیو جاب نہیں ہے۔
س سب کے باوجود بھی اس میں ایک اپنا مزا ہے' ایک
کھی سی لذت ہے۔"
وہ پتا نہیں کیوں لیکچر دے رہے تھے۔ یہ باتیں میں
وں سے جانتا تھا۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا کچھ بے چین سا
و کر میں نے ان کی بات کاٹی "ٹائم کا مسئلہ میرے لیے
میں ہے میں چوبیس گھنٹے کام کرنے کو تیار ہوں۔"
"تم جوش میں آکر....."
"نہیں سر! مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے
نسومینیا ہے۔ میں کام کر کے تھکتا نہیں ہوں۔ میں
واقعی چوبیس گھنٹے کام کرنے کو تیار ہوں۔"
وہ چند ثانیے بغور میرا چہرہ دیکھتے رہے' پھر بولے "میں
تمہیں ایک مہینے کے ٹرائل پر ڈیوٹی منیجر رکھتا ہوں اگر
تمہاری کارکردگی تسلی بخش رہی تو....." انہوں نے فقرہ
ادھورا چھوڑ دیا۔
میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ ایک ہفتے کی تنخواہ
قریباً" اٹھارہ ہزار پاکستانی روپے بنے گی۔ یعنی قریباً" بہتر
ہزار پاکستانی روپے میں ایک مہینے میں کما سکتا ہوں۔ یہ بہت
کم تھا۔ اپارٹمنٹ کے خرچے' بلز اور ٹیکسز میں بہت
کچھ نکل جائے گا' پھر پاکستان رقم بھی بھجوانی ہو گی۔ یہ
بہت کم تھا' مگر فی الحال میں نے اسی کو کافی سمجھتے ہوئے
اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ سے باہر
تھی۔ وہ مجھ پر مہربان کیوں ہو رہے تھے؟

☆ ☆ ☆

کال سینٹر پر ایک لمبا عرصہ کام کرنے کے بعد ہر طرح
کے لوگوں سے ڈیل کرنے کا طریقہ آ گیا تھا۔ جو بات مجھے
دوسرے ورکرز سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ میرا وینس برج
پر چوبیس گھنٹے بیٹھنا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ
اس بزنس میں کام کم اور وقت زیادہ لگانا پڑتا ہے۔ اگر آپ
کو ایسا ورکر مل جائے جو تمام دن ہوٹل چلا سکے تو اور آپ کو
کیا چاہیے؟ میری وجہ سے عمر اور حیدر کو ہوٹل پر نہیں آنا
پڑتا تھا۔ (جس پر وہ "خرم بھائی" کے تہہ دل سے مشکور
تھے)
اس روز ایک عجیب سی بات ہوئی۔
ایک سوٹ Suite کی بکنگ کو کمپیوٹر پر منتقل کر کے میں
باہر لاؤنج میں آ گیا۔ کارڈلیس فون میرے ہاتھ میں ہی تھا'
کیونکہ ہر دس منٹ بعد گھنٹی ضرور بجتی تھی۔ میں نے فون
لاؤنج میں رکھا' کچن سے اپنے لیے کچھ فرنچ فرائیز نکالے
اور لاؤنج میں واپس آ گیا۔ فرنچ فرائز کے ساتھ ہی مجھے عماد
یاد آ گیا۔
عماد کا خیال ذہن میں آتے ہی میرے لبوں پر ایک
مسکراہٹ بکھر گئی' میں نے اتنا ہنس مکھ لڑکا آج تک نہیں
دیکھا تھا۔ منہ تک جاتا میرا ہاتھ یکدم رک گیا۔ اسے کہتے
ہیں شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر! بیرونی دروازے سے
عماد اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا۔
وہ لڑکا جو شکل و صورت سے پاکستانی یا انڈین لگتا تھا اور قد
میں عماد سے کچھ لمبا تھا' اس کے ساتھ بحث میں الجھا ہوا
تھا۔ وہ دونوں دھیمی سرگوشیوں میں کسی بات پر تکرار کرتے
ہوئے آ رہے تھے۔ عماد بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا' عماد اتنا
الجھا ہوا۔ دکھ رہا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور
سیدھا آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی' اس
نے چہرے کے تاثرات پرسکون کرنے کی ناکام کوشش کی
اور مجھے سلام کر کے رسمی کلمات ادا کیے۔
وہ لڑکا دور کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ عماد نے اس کا تعارف
بھی نہیں کرایا۔ پھر اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا لڑکا اس
کے قریب آیا تو وہ سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگا' اس لڑکے
نے اس کا بازو پکڑا اور اردو میں بولا۔

"عماد! پلیز تو میرا دوست نہیں ہے کیا؟"
عماد نے جواب پنجابی میں دیا "تم فضول بات کر رہے ہو
اسے سمجھاؤ۔"
"وہ نہیں مانتی..... "اب کے وہ لڑکا بھی پنجابی بول رہا
تھا۔
"تم پیار سے سمجھاؤ۔"
"وہ نہیں مانتی۔"
"اس کو پاس بٹھاؤ اور پوچھو کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ
ہے؟" عماد جھنجھلایا۔
"سب کر کے دیکھ چکا ہوں۔ وہ نہیں مانتی۔"
"کوئی اور طریقہ سوچو۔" عماد نے نظریں چراتے ہوئے
کہا۔
"طریقہ تو میں نے بتایا ہے۔" وہ اب منت کر رہا تھا۔
"نہیں نہیں اگر بابا یا امی کو پتہ چل گیا تو بہت برا ہو گا۔
ویسے بھی میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا۔"
"تم یقین کرتے ہو! تم نے خود ساری بات شروع کی تھی
'اور اب مکر رہے ہو۔"
"وہ فراڈ ہے۔" عماد زور دے کر میری موجودگی کا
احساس کیے بغیر بولا۔
"کیسے؟ اس کو ریحام کی مما کا نام تک معلوم تھا۔"
عماد نے اپنا بازو چھڑایا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا' مگر
وہ لڑکا پھر اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گیا۔
"عماد' مجھے اس کا ایڈریس دے دو۔" دور ہونے کے
باعث اس کی آواز اب قدرے کم سنائی دے رہی تھی۔
"میرے پاس اس کا پتہ نہیں ہے۔ تم ریحام سے لے
لو۔" اتنا کہہ کر عماد نے اسے ہٹا کر بیرونی دروازہ کھولا اور باہر
چلا گیا۔ وہ لڑکا بھی بھاگتا ہوا اس کے پیچھے چلا گیا۔
"واؤ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا مسٹری ہے
۔ واپس جا کر میں سمل کو اس بارے میں ضرور بتاؤں گا۔"
میں نے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

عماد سے میری ملاقات اگلے دو روز تک نہیں ہوئی میں
اس کی اور اس لڑکے کی پراسرار سرگوشیوں کو بھلا چکا تھا
جب اس دن صبح نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی' میں نے
ایک ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا' جبکہ دوسرے ہاتھ سے روم نمبر
203 کا بل بنانے لگا۔
"ویلکم ٹو دی وینس برج ہوٹل کین آئی ہیلپ یو؟"
دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری "کیا میں عماد
سے بات کر سکتی ہوں؟"
"عماد اولڈ و کریج ہوٹل پر ہوتا ہے ادھر تو وہ بس جمعے کو آتا
ہے ابھی وہیں ہو گا۔"
"میں نے وہاں فون کیا تھا وہ کہہ رہے تھے وہ وہاں نہیں
ہے' وینس برج پر ہے۔"
"اچھا شاید وہ یہاں آ رہا ہو' میرا خیال ہے وہ راستے میں
ہو گا۔ آپ بیس منٹ تک کال کر لیں۔" میں نے کھانے
اور ڈرنکس کے چارجز کو جمع کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں میں دوبارہ کال نہیں کر سکتی میں نیو کاسل جا رہی
ہوں۔ آپ ایک ایڈریس نوٹ کر لیں۔" اس کے کہنے پر
میں نے کی بورڈ پر سے انگلیاں ہٹالیں اور نہایت پھرتی سے
نوٹ پیڈ اور قلم پکڑ لیا۔
"عماد کو کہیے گا یہ ایڈریس ریحام نے دیا ہے۔" پتہ
لکھوا کر اس نے کہا میں نے اس کا نام لکھا اور سلسلہ
منقطع ہو جانے پر فون بند کر دیا۔
کیا نام بتایا تھا اس لڑکی نے؟ ریحام؟ میرے ذہن میں
اس نوجوان کا فقرہ گونجنے لگا جو اس روز عماد کے ساتھ تھا۔
"اس کو ریحام کی مما کا نام تک معلوم تھا۔" اور پھر عماد نے
کہا تھا "اس کا پتہ میرے پاس نہیں ہے تم ریحام سے لے
لو۔"
یہ ریحام کون تھی؟ میں نے نوٹ پیڈ اٹھا کر اپنے سامنے
رکھا اور اس پر اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا گیا پتہ بغور پڑھا
جس اسٹریٹ پر موجود پب کا وہ پتہ تھا' وہاں میں ایک دفعہ
وہاں ایک مہمان کو پک کرنے گیا تھا میں نے دوبارہ نام
پڑھا۔ میڈم کیرن یہی وہ شخصیت تھی جس کو کسی کا نام
معلوم تھا' اور اسی عورت کا پتہ حاصل کرنے کے لیے عماد کا
دوست بہت بے چین تھا' معلوم نہیں کیا معاملہ تھا میں نے
کچھ سوچتے ہوئے عماد کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ فون پہلی ہی
گھنٹی پر اٹھا لیا گیا تھا۔
دوسری جانب سے بغیر کسی سلام دعا کے افتاد نازل ہوئی
تھی "میں نے کہا تھا کہ یہاں فون مت کیجئے گا ورنہ میں سچ
مچ پولیس کو بلا لوں گی میرے انکل اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہیں
سمجھے آپ؟" لہجہ دھمکی آمیز تھا۔
ایک لمحے کو میں نے حیرانی سے ریسیور کو گھورا' پھر اسے
کان پر لگا کر آرام سے بولا "آپ نے مجھے نہیں بتایا تھا۔

www.Paksociety.com

ں فون کرنے کی غلطی نہ کرتا۔"
ثانیہ وہاں خاموشی چھائی رہی' پھر وہ کچھ معذرت
انداز میں بولی "اوہ آئی ایم سوری دراصل کوئی کافی
فون کر کے تنگ کر رہا تھا۔"
وینس برج سے بات کر رہا ہوں عماد ہے؟"
تو کہہ رہا تھا وینس برج جا رہا ہے۔ اس کی جگہ
اولڈو کر تیج پر چلا گیا تھا نا۔"
چھا؟" میں نے دروازے کی جانب دیکھا "وہ آیا تو
"
آپ کون بول رہے ہیں؟"
خرم!" مختصراً "جواب دے کر میں فون رکھنا چاہ رہا تھا
ں نے فوراً "کہا" اوہ تو آپ خرم ہیں۔ انکل آپ کی
عریف کرتے ہیں۔" اس نے آپ پر زور دیا۔
ھینکس۔ یہ بلال صاحب میری تعریفیں کیوں
تے ہیں؟"
میں فریا ہوں۔ عماد اور عمر کی بڑی بہن۔" وہ لمبی بات
نے کے موڈ میں تھی۔
عماد آئے تو اسے کہہ دیجئے گا مجھ سے کانٹیکٹ کر
"میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے لڑکیوں سے فون
ں ہانکنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔
ں نے ایک دفعہ پھر اس ایڈریس کو پڑھا۔
طانیہ میں مستقل سکونت پذیر پاکستانی اور انڈین مسلم
ن تو اہم پرست ہوتے ہیں۔ ان کے گھروں کی
یں جو اکثر شادی کے بعد اپنے برٹش نیشنل خاوندوں
ساتھ رہنے آتی ہیں' ان کے کام کے اوقات سے گھبرا
ہیں۔ شوہر صبح آٹھ بجے سے چار تک کام کرتا ہے' پھر
ٹائم جاب پوری کرتے ہوئے رات کے آٹھ بجا دیتا
یہ بیویاں سمجھتی ہیں کہ وہ کسی گوری کے چکر میں ہیں۔
ن ہو کر یہ بیویاں پاکستان کے کسی سفلی علم کے ماہر
سر صاحب یا بابا جن کے اشتہارات دی سن اور ڈیلی مرر
میں چھپتے ہیں' جب شوہر گھر آتے ہیں تو بیوی کو تسبیح
میں لیے دیکھ کر کافی خوش ہوتے ہیں۔ ان کا دل تھوڑا
نرم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بیگمات پر زیادہ توجہ دینے
ہیں۔ اس کے بعد یہ خواتین ان باباؤں کا منہ سونے
بھر دیتی ہیں۔ ان باباؤں کے پاس اتنا روپیہ ہوتا ہے کہ
یلی گراف اور دی سن میں اشتہارات چھپوا سکتے
۔

اس قسم کے بابا اور جادوگر صرف بنگالی' ہندو اور مسلم نہیں ہوتے یونان اور اٹلی میں ایسے کئی پروفیسرز' میڈمز وغیرہ ہوتی ہیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ لیڈز میں بھی کوئی ایسی میڈم رہتی ہے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔
عماد اور اس کا دوست اور وہ ریحام نامی لڑکی بھی غالباً" دھوکہ کھا گئے تھے میں نے اندازہ لگایا اندازے لگانے میں میں ہمیشہ سے اچھا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز مجھے حال میں واپس لے آئی' کی رنگ انگلی میں گھماتے ہوئے عماد کوئی دھن زیر لب گنگناتا آ رہا تھا۔
"ہائے بڈی!" وہ مزے سے کہتا ہوا میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا "کام کیسا جا رہا ہے؟"
"کام کو چھوڑو تمہارے لیے فون آیا تھا۔"
"کس کا؟ سونیا کا؟" وہ بے ساختہ کہہ اٹھا میرے نفی میں سر ہلانے پر اس نے منہ بنایا "پھر؟"
میں نے ایک گہری سانس بھری "ریحام کا۔"
"ہنی کا؟ اس نے کیوں کیا فون؟" وہ حیران ہوا۔
"تمہارا پوچھ رہی تھی' کہہ رہی تھی' نیو کاسل جا رہی ہے۔ ایک پتہ لکھوایا ہے۔" میں نے کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ میری لکھائی میں لکھا ہوا پتہ پڑھ کر اس کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔ "یہ تم نے کسی کو دکھایا تو نہیں ہے؟"
میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"مجھے حیرت ہے عماد' تم اس قسم کے لوگوں پر یقین کرتے ہو۔ یہ میڈ مز فراڈ ہوتی ہیں۔"
"ناٹ دس ون۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اس کی آواز میں ایک نامعلوم سی بے چارگی تھی۔
"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"
"جس لڑکی نے تمہیں فون کیا تھا' اس کا نام ریحام ہے۔ میں رضا اور ریحام بچپن کے فرینڈز ہیں۔ ریحام کی بڑی بہن اہل کو یونیورسٹی میں ایک مصری لڑکا ملا۔ صرف چار روز کی ملاقات کے بعد اس نے اس سے شادی کر لی اور گھر والوں سے الگ ہو گئی۔ وہ اپنا الگ فلیٹ لے کر رہنے لگی۔ وہ مصری لڑکا وہاں سے واپس مصر چلا گیا۔ اہل اپنی جیولری بیچ کر اپنے شوہر کو پیسے بھجوانے لگی۔ اس کے والدین نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ وہ اس لالچی لڑکے کو چھوڑ دے مگر وہ نہ مانی۔ وہ لڑکا برابر اس سے پیسے منگواتا رہا۔ اہل نے اپنے والدین سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔"

پھر ایک روز ریحام' ہنی کی ممی کو کسی نے میڈم کیرن کا بتایا۔ جب ہنی اور آنٹی اس کے پاس گئیں تو میڈم نے آنٹی کو ان کے نام سے پکارا میڈم واقعی پہنچی ہوئی ہیں میڈم نے کہا کہ وہ کچھ دنوں میں گھر آ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔"
"پچھلے دنوں رضا اور اس کی منگیتر کے درمیان کوئی چپقلش ہو گئی۔ رضا کو لگتا ہے اس کی منگیتر اب اس کو پسند نہیں کرتی۔ وہ اب رضا سے شادی نہیں کرنا چاہتی' رضا اس سے واقعی محبت کرتا ہے۔ اب وہ مجھ سے اور ہنی سے میڈم کیرن کا ایڈریس مانگ رہا ہے تاکہ وہ اس سے جا کر عاشی کے بارے میں پوچھے۔"
"تو رضا اس سے خود پوچھ لے۔" میں نے مسئلے کا حل بتایا۔
"وہ پوچھ چکا ہے' وہ کچھ نہیں بتاتی۔"
"پلیز عماد! اس کو میڈم کیرن کا پتہ مت دینا۔ وہ وقت ضائع کرے گا یہ لوگ فراڈ ہوتے ہیں۔"
عماد نے سر ہلا دیا مگر میں جانتا تھا کہ وہ یہ ایڈریس رضا کو ضرور دے گا۔ حد تھی توہم پرستی کی' دل ہی دل میں میں نے میڈم کو کئی گالیاں دے ڈالیں۔

☆ ☆ ☆

ڈور بیل بجائے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے جو چہرہ نظر آیا اسے دیکھ کر میں نے ایک لمحے کو سانس لینا بھول گیا۔
اس کی سبز آنکھوں پر لانبی پلکوں کا سایہ تھا۔ اس کے سنہری مائل بھورے بال سنہری جلد کے ساتھ بہت بھلے لگ رہے تھے۔ ان ہونٹوں پر کوئی لپ اسٹک نہیں تھی' مگر وہ بہت سرخ تھے۔ بلیو جینز کے اوپر میرون ٹی شرٹ اور گلے میں لاپرواہی سے ڈالے گئے اسکارف میں کھڑی وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔
میں خوب صورتی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ صرف ایک لمحے کو میں مبہوت ہوا تھا' پھر فوراً" سنبھل کر مسکرا دیا۔ "السلام علیکم۔"
"وعلیکم السلام۔" وہ خوش دلی سے بولی "آپ خرم ہیں۔"
"جی!" میں نے مسکراہٹ کو قدرے کم کر کے اپنی ازلی بے نیازی اور مغرورانہ پن کو چہرے پر طاری کیا۔
"میں فریا ہوں آپ سے ایک روز فون پر بات ہوئی تھی۔"
"جی مگر آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ گھر آئے مہمانوں کو دروازے پر ہی سے ٹرخا دیتی ہیں۔"
وہ خفیف سی ہو کر بولی "اوہ آئی ایم سوری! آپ اندر آئیں۔" میں مسکرا دیا اور اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔
آٹھ بیڈ رومز پر مشتمل وہ گھر بہت بڑا تھا' مگر پانچ منٹ بعد ہی مجھے عماد کی بات یاد آ گئی جو اس نے ایک دفعہ ایسے ہی کہی تھی "ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے۔" اس نے بالکل سو بلکہ ایک ہزار فیصد درست کہا تھا۔ اس گھر کے مکینوں کے لیے واقعی وہ گھر بہت چھوٹا پڑتا ہو گا۔
چونکہ بلال احمد اور ان کے دونوں بھائی اختر اور مدثر احمد ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے' اس لیے اس گھر میں اتنے بچے تھے' اتنے بچے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہر سائز' ہر عمر کے بچے سب سے بڑی لڑکی صفوان کی بہن عالیہ تھی اور سب سے چھوٹا ابوبکر مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کون کس کا بھائی' بہن تھا بس ان گنت مکین تھے ان کے گھر میں۔
میں جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا' عماد کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "فریا' فریا سمل کا فون ہے۔" ایک لمحے کو میرے قدم ڈگمگائے تھے' مگر پھر میں فوراً" سنبھل گیا۔
اس دنیا میں ایک نام کے کئی لوگ ہوتے ہیں' میں نے فریا کو تیزی سے فون اسٹینڈ کی جانب جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔
میں پہلی دفعہ عماد کے والد اور مدثر احمد سے مل رہا تھا وہ مجھ سے بہت زیادہ گرم جوشی سے ملے۔ میں تھوڑا سا کیفیوز ہو گیا۔ میں بس ایک عام سا پاکستانی لڑکا تھا جو ان کے ہوٹل پر ملازمت کرتا تھا۔ پھر وہ مجھ سے اتنے اچھے سلوک سے پیش کیوں آ رہے تھے؟
کافی دیر تک بلال احمد اپنے گھر والوں کو بتاتے رہے کہ خرم کتنا سمجھ دار اور اچھا بچہ ہے۔ جبکہ میں بے گناہ ملزموں کی مانند نگاہیں فرش پر مرکوز کیے دل ہی دل میں اس منحوس گھڑی کو کوستا رہا جب میں نے ان کی دعوت قبول کی تھی۔
کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں جاتے ہوئے میرے کان میں عماد کی کسی کزن کی سرگوشی پڑی جو دھیرے سے حیدر سے مخاطب تھی۔
"بہت مغرور لگتا ہے' مگر ہے بہت ہینڈسم۔"

www.Paksociety.com

"فریا آبی کے ساتھ پرفیکٹ ہے۔ کتنا اچھا کپل بنے گا نا' بلال انکل بھی کل یہی کہہ رہے تھے۔"

میرا سر گھومنے لگا۔ خدایا یہ نوازشیں' عنایتیں' مہمان نوازیاں یہ سب اپنی غرض کے لیے تھا؟ وہ میرے بارے میں خود ہی کون سے فیصلے کر بیٹھے تھے۔

کھانے کی میز پر مدثر احمد نے مجھ سے پوچھا "تم آگے کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں تو بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایم بہت سے ہونٹلز بنانا ہے۔"

"تمہیں ہونٹلز بنانے کا شوق ہے یا پیسہ کمانے کا؟"

"مجھے پیسہ چاہیے۔ کیونکہ میں جس کی وجہ سے پاکستان چھوڑ کر یہاں آیا ہوں' وہ دولت کا حصول ہی ہے۔" میں نے دیکھا سب کی توجہ میری طرف تھی۔

"ویسے تمہیں جلد ہی بہت مواقع ملیں گے" مدثر احمد بولے "تم بریڈ فورڈ چھوڑ کر لیڈز کیوں آگئے؟"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے دل ہی دل میں "لمبی کہانی" تیزی سے سوچنا شروع کردی۔

"بتائیں نا خرم بھائی۔" حیدر دلچسپی سے بولا۔

"جس خاتون سے میں نے جا کر قرضہ مانگا تھا' وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہو گئی میں نے یہ کہہ کر کہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہوں' وہ جاب چھوڑ دی اور بددل ہو کر بریڈ فورڈ سے یہاں آگیا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

میری بات پر ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا "کس کس سے جھوٹ بولیں گے آپ؟" فاطر بولا۔

"جھوٹ؟" میں نے مصنوعی حیرت سے اس کو دیکھا "میں پاکستان میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اس کا باپ بہت امیر تھا۔ میرے پاس پیسہ نہیں تھا میں اسی لیے انگلینڈ آیا ہوں تاکہ پیسہ کماؤں' پاکستان واپس جاؤں اور اس سے شادی کرلوں۔ میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔ میں واقعی کسی کے ساتھ کمٹڈ ہوں۔"

ڈائننگ ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ عماد کے ابو بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ باقی سب کی بھی ایسی ہی حالت تھی خود عماد کا منہ آدھا کھل گیا تھا۔ فریا کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

"تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔" بلال احمد نے پوچھا۔

"میں کیوں بتاتا؟ اس ویری پرسنل۔ اب اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ نے مجھے گھر پر انوائٹ کرکے آنر دیا ہے۔ میں نے کوئی بہت شاکنگ بات کہہ دی ہے کیا؟"

چند ثانیے میں کمرے میں موجود نفوس کے حیرت اور الجھن و تفکرات سے بھرے چہرے دیکھتا رہا پھر چیئر کو ایک جھٹکے سے اٹھا اور بولا۔

"سر' شاید آپ مجھے غلط سمجھے۔"

اتنا کہہ کر میں رکا نہیں بلکہ لمبے لمبے ڈگ اٹھاتا ہوا اس اٹالین طرز کے خوب صورت گھر سے باہر نکل آیا۔

مجھے عماد بہت پسند تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ پرسوں جا کر مجھے ریزائن کرنا تھا اور پھر نئی جاب ڈھونڈنا تھی۔

دکھ' صدمہ' رنج' ملال اور غصہ سب کچھ میں اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا میری قابلیت اور محنت دیکھ کر مجھے ٹرائل پر رکھنے کے بعد مستقل جاب دے دی گئی تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اب بھی مجھے ویسا ہی سمجھا گیا ہے جیسے اسلام آباد میں سمجھا گیا تھا۔ لالچی اور مکار۔ اگر مجھے اس طرح دولت حاصل کرنا ہوتی' تو شیخ جہانگیر کے پاس اس کی کمی نہیں تھی۔ اگر میں پاکستان چھوڑ کر آیا تھا تو اس لیے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر سمل کی آرزوؤں اور امنگیں پوری کرسکوں۔ میں تو اپنے خواب ڈھونڈنے آیا تھا' مگر لوگ کیوں اتنے خودغرض ہوتے ہیں۔

"کیا مصیبت ہے" میں نے زور سے بیئر کے خالی کین کو ٹھوکر ماری اور وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

جگہ کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا تو فوراً" یاد آگیا۔ اس اسٹریٹ کا نام ہیبر تھا۔ ہیبر ہلز کے آس پاس کی کوئی جگہ تھی' کوئی خاص جگہ جس کا اسم گرامی میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے مختلف ریسٹورینٹس میں گھرے ایک قدیم اور پرانا سا لکڑی کے پب پر پڑی اس کے باہر ایک خستہ حال لکڑی کے بورڈ پر میڈم کیرن لکھا تھا۔ میرے لبوں پر بے ساختہ ہی ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

ذہن میں میڈم کیرن کی پب کا نقشہ بالکل اینڈرسن کی کسی فیری ٹیل جیسا آیا تھا۔ میڈم کوئی ستر اسی برس کی جھریوں بھرے چہرے کی مالک خاتون ہوں گی جس کے سفید بال خوفناک طریقے سے بکھرے ہوں گے۔ اس کے سر پر ایک نوک دار کالی ٹوپی اور جسم پر لمبا' سیاہ لبادہ ہو گا۔ کافی لمبی اور سامنے کے دانت کالے ہوں گے۔ لمبے لمبے ناخنوں پر سرخ نیل پالش لگی ہوگی۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

تب ہی کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

ایک لمبا، سوکھا سڑا ہوا گورا، مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا "تمہارا نام خرم ہے؟" وہ سرد لہجے میں پوچھنے لگا۔

میرے چہرے سے مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی تھی۔

"تم کون ہو؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ میرا سوال نظر انداز کر کے بولا۔ "تمہیں پب میں میڈم کیرن بلا رہی ہیں۔" میرے دماغ میں ایک دم کئی دھماکے ہوئے تھے میں تو کسی بھی طرح سے میڈم کیرن کو نہیں جانتا تھا، پھر اس کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔

"میرا دماغ پہلے ہی کئی الجھنوں میں گھرا تھا۔ میری نوکری چھوٹ گئی تھی، جیب خالی تھی مگر اوپر سے ایک نئی ٹینشن نے آن گھیرا۔

"آؤ۔" وہ تھوڑی کرختگی سے بولا۔

"کیوں؟" میرے استفسار پر اس نے ڈھٹائی سے شانے اچکا دیے اور سڑک کے دوسری جانب جانے لگا۔ دو قدم رک کر اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا میں تو تیزی سے اٹھا اور ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے ہو لیا۔

اندر سے وہ کوئی اتنی خستہ حال پب نہ تھی۔ اچھی خاصی ماڈرن تھی۔ وہ "لمبو" مجھے ایک کونے والی میز پر لے گیا اور روکھے لہجے سے بیٹھنے کو کہا تھوڑی دیر بعد وہ ایک بڑا سا سلور کا پیالہ لے آیا جس میں پانی بھرا تھا۔ اس نے وہ پیالہ بڑے احترام سے میرے آگے رکھا۔ (یہ احترام غالباً" پیالے کے لیے تھا) پھر اسی لہجے میں بولا۔

"تھوڑا انتظار کرو میڈم آ رہی ہیں۔" وہ دوبارہ اسی کمرے میں غائب ہو گیا جہاں سے پیالہ لایا تھا۔

میں نے کچھ آگے کو جھک کر اس سلور کے پیالے کو بغور دیکھا۔ اس کے پیندے پر کسی اور زبان میں کچھ لکھا گیا تھا یا پھر شاید وہ ڈیزائن تھا۔ ایسے جیسے ایک چھوٹے دائرے کے گرد تھوڑا بڑا دائرہ، اس کے گرد اور بڑا اسی طرح پانچ دائرے سے بنے تھے۔

میرے ساتھ والی کرسی پر ایک عورت آ کر بیٹھ گئی۔ شاید ویٹرس ہو میں نے سوچا اور نہایت بے چینی سے میڈم کیرن کا انتظار کرنے لگا۔ جو عورت میرے قریب بیٹھی تھی، اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہو گی اپنے کالے بالوں کو اس نے نہایت نفاست سے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اپنی اسکرٹ بلاؤز کی طرح شفاف کرے تھیں۔ جیسے کانچ کی بنی ہوں۔ اس کی سنہری رنگت پر وہ آنکھیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر اتنی شادمانی کہ بے اختیار میری نظریں اس پر جم گئیں میرے یوں دیکھنے پر وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بہت نرم مسکرانے سے اس کی آنکھوں کے گرد دھیمی دھیمی سی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ وہ اپنی مدھم آواز میں بولی۔

"میرا نام میڈم کیرن ہے۔ تم سڑک پر کیوں بیٹھے تھے۔ ادھر میرے پاس آ جاتے۔"

میں مبہوت سا ہو کر اس کو دیکھے گیا۔ وہ کوئی جادوگرنی ٹائپ عورت تو ہرگز نہ لگ رہی تھی، بلکہ اس کی شخصیت سے ایک نفاست اور وقار جھلکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو، خرم!" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ان آنکھوں میں نجانے کیا سحر تھا کہ میں وہاں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا، کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ اسے ریحام کی امی کا نام کیسے پتہ چلا؟ وہ کیوں معصوم لوگوں کو دھوکہ دے رہی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ وہ فراڈ ہے، وہ اس سب کے باوجود بھی لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی، کیوں؟ اب مجھے ادھر بلا کر وہ کون سا نیا گیم کھیلنا چاہ رہی تھی۔ میں بہت کچھ بولنا چاہتا تھا، مگر الفاظ تو جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ میں نے لب کھولے، مگر آواز اندر ہی کہیں گھٹ گئی تھی۔

"یہ پانی پیو۔" اس نے شفقت بھرے لہجے میں سلور کے کٹورے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہروپ ہے، ڈرامے کر کے پیسے بٹورنا چاہ رہی ہے۔ اگر یہ بے رنگ مائع جسے وہ پانی کہہ رہی ہے، پانی کے بجائے کچھ اور ہوا۔ جو مجھے بے ہوش کر دے بلکہ مار بھی دے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ اس شہر میں تو ویسے ہی مجھے کوئی نہیں جانتا تھا جو جانتے تھے ان کی نوکری میں نے چھوڑ دی تھی۔ میرے دماغ میں کہیں سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ مجھے کوئی بھاگ جانے کا کہہ رہا تھا، خطرے کی گھنٹی کہیں دور سے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے، میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

مگر وہ میرے ہی ہاتھ تھے جو بڑھے تھے، وہ میری ہی انگلیاں تھیں جنہوں نے اس پیالے کو تھاما تھا، اور وہ میرے ہی لب تھے جنہوں نے اس پانی کو اپنے حلق میں انڈیلا تھا۔ اس کا ذائقہ بالکل پانی جیسا تھا۔ میڈم کی ہدایت کے مطابق میں نے آدھا کٹورا پانی کا باقی واپس رکھ دیا۔

میڈم کیرن جھک کر اس بے رنگ مائع میں کچھ دیکھنے لگی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد اس نے سر اٹھایا، اب کے وہ بولی تو اس کی آنکھوں اور لہجے میں ایک گہرا غم جھلک رہا تھا۔

"وہ اب بھی اپنے ڈارسی کا انتظار کرتی ہے۔ وہ اب بھی اپنے ڈارسی کے لیے روتی ہے۔"

مجھے اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا وہ کس کی بات کر رہی تھی۔

"وہ سمجھتی ہے تم نے اسے دھوکا دیا۔ وہ سمجھتی ہے کہ تم لالچی ہو۔ تم نے کوئی وضاحت کیوں نہ پیش کی؟" وہ تاسف انگیز لہجے میں بولی۔

"کون...؟" میرے لبوں سے نکلا۔

میڈم کیرن نے سر اٹھایا اور اپنی کانچ سی آنکھوں سے میری بھوری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"وہی جو اس دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔"

"سمل..." بے اختیاری میں کہہ اٹھا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"آپ نے اس لڑکے کو بھیج کر بلوایا تھا۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے انگلینڈ کیوں آئے تھے؟"

"پیسہ کمانے۔" میں نے خود کو کہتے سنا۔

"نہیں، تم اس کے ایک چھوٹے سے خواب کی تکمیل کے لیے ڈھیر ساری دولت حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے تم یہاں آئے تھے، تاکہ اس کی باپ کے اسٹیٹس تک پہنچ کر اس کا ہاتھ مانگ سکو۔"

"میرے اپنے بھی خواب ہیں۔"

"اس کا خواب تمہارے خوابوں پر غالب آ گیا تھا تمہارے خواب تمہیں کھینچ کر انگلینڈ نہیں لائے، تمہیں اس کی ایک آرزو یہاں لائی ہے۔ مگر وہ اتنا بڑا خواب تو نہ تھا کہ تم اس کا دل توڑ دیتے۔"

"میں نے..."

"تم نے کوئی وضاحت نہ دی، اسے انتظار کرنے کو بھی نہ کہا۔ اتنا تو کہہ دیتے کہ میرا انتظار کرنا۔"

"میں سچا تھا، سچے لوگ وضاحتیں نہیں پیش کرتے، صفائیاں نہیں دیتے۔ اگر اس کو میری محبت کا اعتبار ہے تو وہ میرا انتظار کرے گی۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"تم نے یہ نہ سوچا کہ اس کی شادی ہو گئی تو...؟"

"نہیں... اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو وہ میرا انتظار کرے گی۔"

"تمہارا انتظار؟"

"اس وقت کے آنے کا انتظار جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں گا۔"

وہ چند ثانیے میری طرف دیکھتی رہی، پھر دوبارہ جھک کر پیالے میں دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو، میڈم؟"

"دیکھ رہی ہوں کتنا انتظار کرنا پڑے گا تمہیں..." وہ پانی کو دیکھتی رہی، بے تاثر چہرہ لیے اس کی جھکی آنکھوں کو دیکھتا رہا وہ کتنا کچھ جانتی تھی، وہ سب کچھ، جو میں بھی نہ جانتا تھا۔ ایک دم ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ حیرت اور خوف سے اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

"نہیں... نہیں..." وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی۔

"کیا ہوا میڈم؟" میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"نہیں... نہیں... خرم، واپس چلے جاؤ۔ جاؤ چلے جاؤ۔"

"کیوں؟" میں نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"نہیں خرم! اس سے پہلے کہ تم اپنی محبت کے جگنو گم کر دو، اپنے خواب مٹی میں ملا دو۔ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ یہ انتظار بہت لمبا ہے۔ نہیں، تم چلے جاؤ۔" وہ جھٹکے سے اٹھی اور زور سے چیخی۔

"گو بیک..."

اتنا کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اس دروازے میں گم ہو گئی جہاں سے آئی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے میں پب سے باہر نکل آیا۔

زندگی میں پہلی بار میں خوف زدہ ہوا تھا۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

www.Paksociety.com

دوسری اور آخری قسط

چونکہ اگلے روز اتوار تھا' اسی لیے پیر کی صبح میں بلال احمد کے دفتر چلا گیا۔

"سر یہ میرا ریزیگنیشن ہے۔" میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ ان کی میز پر رکھا' مڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر ان کی آواز نے دفعتاً میرے قدم روک دیے۔

"واپس آؤ۔"

بادل نخواستہ ہی میں واپس کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

"تم دن بدن زیادہ مغرور نہیں ہوتے جا رہے؟" ان کے کہنے پر میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا' وہ مسکرا رہے تھے۔

"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔"

"میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اس دن ایویں تم غصہ میں اٹھ کر چلے آئے۔ وہ عماد ہے نا' اس وقت سے کہہ رہا ہے کہ انکل' آپ نے اس اکڑو خان کو ناراض کر دیا ہے حالانکہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔"

"آپ نے نہیں کہا تھا' مگر....."

"جب میں نے ہی کچھ نہیں کہا تو تم کیوں ناراض ہو رہے ہو؟ آرام سے واپس آکر کام سنبھالو۔"

"لیکن سر.....!"

"اوئے ..... مجھے تمہارے جیسا ورکر پورے شہر میں نہیں ملے گا۔ آرام سے جا کر سیٹ پر بیٹھو۔" انہوں نے اس بار قدرے ڈانٹ کر کہا۔ تو میں مسکرا دیا۔

"اچھا مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"مجھے تیس لاکھ پاؤنڈز قرضہ چاہیے۔"

"فوراً"؟"

"فوراً"!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بینک سے یا.....؟"

"بینک سے نہیں۔ آپ سے یا کسی اور امیر آدمی سے جس کے پاس اتنا پیسہ فالتو پڑا ہو۔"

"میرے پاس سے تمہیں....." انہوں نے ایک لمحہ کو رک کر میری طرف دیکھا' پھر مسکرا کر بولے "مل سکتا ہے"

میں بے ساختہ ہی ہنس دیا۔

میری ایک مشکل تو کسی حد تک آسان ہو ہی گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میڈم کیرن نے مجھے یہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میڈم کیرن کے پاس سے آنے کے بعد میں نے اپنے [illegible] کمرے کے فلیٹ میں نہایت بے چینی سے رات گزاری تھی۔

میڈم کو یہ سب کیوں اور کیسے پتہ تھا؟ میرے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت نہ تھا۔ مجھے سیمل کی فکر تھی۔ وہ مجھے لالچی سمجھنے لگی تھی۔ اس کے لیے میں ملک چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ میں اس کے برابر پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے کم از کم اسے فون تو کر لینا چاہیے تھا' کسی طرح اس کی خبر گیری تو کرنی چاہیے تھی۔ مجھے یہاں آئے ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا' مگر میں نے ایک دفعہ بھی اس سے بات نہ کی تھی۔ کیوں؟ دل نے پوچھا تھا۔

کیونکہ تمہیں اپنے مقصد کا خیال تھا۔ دماغ نے جواب دیا تھا۔ کیونکہ تم خوف زدہ تھے کہ اگر اسے کال کر لیا تو تمہارا دماغ وہیں اٹک جائے گا اور تم یکسوئی سے کام نہیں کر سکو گے۔ تم بزدل نہیں' اصول پسند ہو۔

کیا محبت میں بھی اصول ہوتے ہیں؟ دل نے پوچھا تھا۔

محبت میں اصول نہ ہوں لیکن معاشرے میں تو ہوتے ہیں۔ اور میں اس کا سامنا تب کروں گا۔ جب میں خود کسی قابل ہوں گا اور کسی قابل بننے کے لیے مجھے اپنے ہونٹلز بنانا تھے۔ بلکہ ہوٹلوں کی ایک پوری چین۔

دو روز بعد سب کام سے فارغ ہو کر میں نے یلو پیجز نکالے اور رئیل اسٹیٹ بروکرز کے نمبر تلاش کرنا شروع کر دیے۔ سب سے بڑا بروکر "وارنر اینڈ ایسوسی ایٹس" تھا۔

اس کا نمبر ملا کر میں نے مسٹر وارنر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"کون بات کر رہا ہے؟" دوسری جانب سے مسٹر وارنر کے سیکرٹری نے پوچھا تھا۔

"خرم زید۔"

چند منٹ بعد مسٹر وارنر لائن پر آگئے۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"مسٹر وارنر! میں ایک ہوٹلیئر ہوں اور فی الحال ایک خوب صورت ہوٹل تعمیر کرنے کے لیے ایک اچھی لوکیشن ڈھونڈ رہا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"پھر تو آپ نے بالکل صحیح جگہ پر فون کیا ہے۔ ہم اس کام میں ماہر ہیں۔ ویسے کوئی مخصوص جگہ ہے آپ کے ذہن میں؟"

"نہیں تو!"

"خیر' یہ کام تو ہمارا ہے۔ آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ کر یہ بتائیں کہ تقریباً کتنا اماؤنٹ ہو گا آپ کے پاس؟" وہ خوش اخلاقی سے پوچھنے لگا۔

"تین ملین پاؤنڈز۔" میں نے تفاخر سے کہا۔

چند ثانیے وہ خاموش رہا پھر مدھم سی آواز میں بولا۔

"تین ملین؟"

"جی۔"

"اور آپ کوئی خوب صورت ہوٹل تعمیر کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"خوب صورت ہوٹل سے مراد اندرون شہر میں کوئی سستا سا ہوٹل ہے؟"

"بالکل بھی نہیں۔"

"تب تو ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے مسٹر زید!"

"مگر کیوں؟"

"دیکھیے مسٹر زید! تین ملین بہت تھوڑی رقم ہے۔ اس سے صرف کوئی عام سا ہوٹل ہی بن سکتا ہے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور فون کریڈل پر رکھ دیا۔ خوامخواہ ہی کسی غلط بروکر کو فون کر دیا ہونہہ! میں نے ناک سکیڑتے ہوئے سوچا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں بیسیوں بروکرز کو فون کرنے کے بعد مجھے اس تلخ حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ تین ملین پاؤنڈز جو کہ تیس کروڑ روپے سے اوپر ہوتے ہیں' اس میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں بن سکتا تھا۔

مگر مجھے بنانا تھا۔ ایک خوب صورت سا منفرد طرز کا ہوٹل' ایک دو گھنٹے کے لیے میں ہوٹل سے کھسک کر "فارسیل" ہونٹلز دیکھنے چلا گیا۔ کئی فارسیل ہونٹلز کے رئیل اسٹیٹ بروکرز سے بھی ملا۔

"اس ہوٹل کی قیمت کیا ہو گی؟" ہر دفعہ یہ پوچھنے پر ملنے والے جواب ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک جیسے تھے۔

"اس ہوٹل کی قیمت ساٹھ ملین پاؤنڈز ہے۔"

"اسی ملین پاؤنڈز....."

"پچاسی ملین پاؤنڈز....."

"پچانوے ملین پاؤنڈز....." سب جواب ایک جیسے ہی تھے۔ مایوس کن۔

میرے تین ملین اب بہت ہی حقیر محسوس ہو رہے تھے۔

www.Paksociety.com

اور پانچ ملین ڈاؤن پے منٹ کے ہوں گے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ مسز فریڈرک نے کندھے اچکا دیے۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

کچھ دیر تک میں دل ہی دل میں جمع تفریق کرتا رہا۔ بالآخر میں نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا "مجھے منظور ہے۔"

"گڈ!"

"اور میں تمہیں تین ملین ڈاؤن پے منٹ کے دوں گا۔"

"نہیں مجھے پانچ ملین ہی چاہئیں۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ تمہیں پانچ ملین نہیں ملیں گے۔"

"تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ تم تین ملین دو گے؟"

"میں تین ملین دوں گا نا، مگر ڈاؤن پے منٹ پانچ ملین ہی ملے گی۔"

اب کے اس نے مجھے کچھ الجھ کر دیکھا۔ "اور باقی کے دو ملین؟"

"وہ تم دو گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھے ہوٹل کی سیکنڈ مورٹیج کے بدلے میں دو ملین دو گی، اس طرح وہ دو، اور میرے تین مل کر ڈاؤن پے منٹ پوری کر دیں گے! رائٹ؟"

"تمہارا دماغ تو صحیح ہے! تم میرا ہی ہوٹل خریدنے کے لیے مجھ سے ہی ادھار مانگ رہے ہو؟"

"بالکل۔" میں نے آرام سے کہا۔

"اور میں کیوں سیکنڈ مورٹیج دوں گی؟" وہ ابرو چڑھا کر پوچھنے لگی۔

"کیونکہ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ جب تک میں رقم ادا نہیں کروں گا، تم ہوٹل کی مالکن رہو گی۔ تم ایسے دیکھو کہ تم خود ہی کو ادھار دے رہی ہو۔" میں نے میز پر قدرے جھک کر کہا۔

وہ کافی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی۔ بالآخر اس نے لب کھولے۔

"یو آر اے ویری اسمارٹ پرسن بٹ یو ہیو دی ڈیل!"

☼ ☼ ☼

"تو سودا طے ہو گیا؟" میری شکل دیکھ کر ہی انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

"جی سر!" میں ان کو تفصیلات بتانے لگا۔

"اب تم اس ہوٹل کا کیا کرو گے؟" بلال احمد پوچھنے لگے۔

"میں اس کو ری بلڈ کروں گا۔ سب کچھ بدل ڈالوں گا۔" میرا لہجہ پرعزم تھا۔ "آپ دیکھئے گا، وہ لیڈز کلب سے خوب صورت ہوٹل بن جائے گا۔"

"آئیڈیا اچھا ہے، ویسے دماغ تمہارا بہت چلتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"تھینکس سر! ویسے بینک مجھے لون دے دے گا؟"

"ہاں ایک بینک میں میرا بہت اچھا دوست کام کرتا ہے۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

پھر جس روز انہوں نے مجھے لون مل جانے کی نوید سنائی، اس شام وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ تمام گھر والے بہت تپاک سے ملے فریا بھی میری اچانک آمد پر بہت خوش تھی، البتہ فریا کی امی کا رویہ کسی بھی جوش سے خالی تھا۔ انہوں نے مروتاً "ہی خوش آمدید کہا۔ انہیں شاید "ہونے والے داماد" کے ہاتھ سے نکلنے کا غم تھا۔

ان کے دو بھائی مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے، نہ ہی عماد، صفوان یا عمر میں سے کوئی تھا۔ یوں کافی دیر تک بیٹھے فیوچر پلانز ڈسکس کرتے رہے۔

☼ ☼ ☼

میں نے جس آرکیٹیکٹ کو ہائر کیا تھا وہ شہر کا مشہور آرکیٹیکٹ تھا۔ قریباً ایک ہفتے کی محنت کے بعد اس نے نقشہ تیار کر لیا۔ ہوٹل میں ایک سو پچاس کمرے تھے سوئٹس کی شکل میں ڈھل جانے کے بعد محض 75 کمرے رہ گئے تھے۔ ڈیلکس رومز صرف پندرہ رکھے تھے ہر کمرے میں ایک آتش دان اور گرینڈ پیانو کا انتظام کیا گیا تھا۔

میں ٹھیکے دار سے ملا اور تمام معاملات طے کر لیے۔

"باقی دے وے، ہوٹل کا نام آپ چینج کریں گے؟"

"ہاں بالکل۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اپنے سر نیم کے مطابق "زید پیلس یا زید پلازہ" رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ....." وہ اپنی پسند کے نام گنوا رہا تھا مگر مجھے کچھ اور یاد آ رہا تھا۔

میں نے کنٹریکٹر کی جانب دیکھا اور آہستہ سے مسکرایا۔

"ہوٹل کا نام sky high ہو گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"صفوان! ٹی وی کی آواز اونچی کرو۔" عماد نے غصے سے صفوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں کرتا کیا کر لو گے؟" صفوان نے ڈھٹائی سے جواب دیا تو عماد نے خود اٹھ کر آواز اونچی کی اور بڑے انہماک سے میچ دیکھنے لگا۔ وہ دونوں میرا سر کھانے کے لیے ہوٹل آئے ہوئے تھے۔

"صفوان! ذرا چیک کرو کوئی ڈیلکس روم خالی ہے یا۔"

میری بات ادھوری ہی تھی کہ عماد نے زور سے "شش" کر کے مجھے چپ کروایا۔

"ہاں بھئی خرم! خاموش ہو جاؤ۔" صفوان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ومبلڈن اوپن لگا ہوا ہے اور دنیا کا فضول ترین کھلاڑی کھیل رہا ہے۔ بھئی خاموش ہو جاؤ۔"

"تمہیں ٹینس سے کوئی تکلیف ہے تو اپنے تک رکھو۔" عماد جو صفوان کے بار بار چینل بدلنے اور آواز ہلکی کرنے پر چڑا بیٹھا تھا، بول اٹھا۔

"شش! کوئی آ رہا ہے۔" میں نے دونوں کا ٹوکا تو وہ فوراً خاموش ہو گئے۔

وہ ایک فرنچ ٹورسٹ تھی جو غالباً گھومنے پھرنے کے لیے باہر جا رہی تھی۔ اس نے کمرے کی چابی میرے حوالے کی اور مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"خرم! آج گھر آ جاؤ، ویسے بھی لاسٹ ویک جب تم آئے تھے تو ہم تو تھے ہی نہیں اور آج تو فریا کیک بنا رہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد صفوان بولا۔

"کام ختم کر کے ہی آسکوں گا نا!" میں نے جان چھڑانا چاہی، مگر وہ بضد تھا۔

"ہم نے تمہارے ہوٹل کی ڈیل کو سیلیبریٹ بھی نہیں کیا۔ چھوٹی سی پارٹی ہو جائے گی۔"

اس نے کچھ اس انداز سے دعوت دی کہ میں ٹھکرا نہ سکا۔

عماد کے گھر جا کر ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے میں چڑیا گھر میں آ گیا ہوں۔ وہاں اتنے بچے تھے کہ خدا کی پناہ اور دو دفعہ کی ملاقات سے ہی وہ میرے فین بن چکے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا کہ ایک کیک اس "آدھے شہر" کے لیے کیسے پورا پڑے گا۔ لیکن جب شام کو اپنے سامنے رکھے "تھری ان ون" یعنی تین کیکس کو ایک دوسرے سے ملا کر رکھا دیکھا تو فریا کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"خرم آپ کا ہوٹل کب تک بنے گا؟" فریا اپنے شیریں لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ایک سال تک۔" میرے کہنے سے پہلے ہی عماد نے جواب دیا تھا۔ اس نے کچھ غصے سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"تم سے کس نے پوچھا تھا؟"

"کسی نے نہیں..... مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرے بولنے پر پابندی بھی نہیں لگائی تھی۔"

"جب تک آپ کا ہوٹل نہیں بنے گا، آپ کیا کریں گے؟" وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ڈاکے ڈالیں گے!" عماد نے پھر ٹانگ اڑائی۔ "بھئی ظاہر ہے کہ وینس برج پر ہی کام کریں گے! ویسے خرم! تمہارے ہوٹل کا سارا عملہ لڑکیوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔" عماد بہن کو نظر انداز کر کے میری طرف متوجہ ہوا۔

☼ ☼ ☼

ایک سال کیسے گزرا؟ مجھے یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جس روز پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تھے، اس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد میرے ہوٹل "اسکائی ہائی" کا افتتاح تھا۔

ہوٹل کے افتتاح کے تین ماہ بعد ہی تمام کا تمام ہوٹل فل تھا اور اگلے دو ماہ کے لیے بک بھی۔ اس شرح آمدن سے میرا قرضہ کم عرصے میں اتر سکتا تھا۔ ہوٹل کی بکنگ دیکھتے ہوئے میں نے نرخ تین گنا بڑھا دیے۔ مجھے معلوم تھا لوگ ضرور آئیں گے۔ آخر ان کو ایک ہی جگہ پر بیک وقت گرینڈ پیانو، آتش دان اور سوئمنگ پول کہاں ملے گا؟

یہ صرف ابتدا تھی۔

اگلے دو برسوں میں بہت کچھ ہوا۔ فریا کی شادی ہو گئی اور وہ فرانس چلی گئی۔ میں نے لیڈز کے چاروں کونوں میں اپنے ہوٹل کھول لیے۔

گھر بھیجی جانے والی کثیر رقم سے جویریہ اور ماریہ کی شادی ہو گئی۔

www.Paksociety.com

اور میں اپنا بزنس مانچسٹر لے گیا۔

مانچسٹر میں کوئین الزبتھ روڈ پر ایک فلی ڈیکوریٹڈ پینٹ ہاؤس خریدنے کے بعد میں نے اپنی بہنوں اور اماں کو انگلینڈ بلوانے کا سوچا۔ مگر اس سے پہلے ہی اماں فوت ہو گئیں۔

میں اماں کے جنازے کو کندھا دینے پاکستان گیا اور سونیا مومنہ' اور سجل کو لے کر مانچسٹر واپس آگیا۔ یوں "جہانگیر پیلس" میں رہنے والی "پرنسس" کے علاوہ پاکستان سے میرا ہر تعلق کٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

مانچسٹر آنے کے دو روز بعد ہی میں اپنے نئے ہوٹل کے لیے جگہ تلاش کرنے نکل پڑا۔

مانچسٹر میں اپنے نئے ہوٹل کے لیے مجھے ومزلو روڈ wimslow road پر ایک جگہ بہت پسند آئی۔ وہاں پر ایک خوب صورت سات منزلہ ہوٹل بن سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت جا کر اس کے بروکر سے بات کی۔

"سوری سر! آپ لیٹ ہو گئے ہیں۔ اس جگہ کو خریدنے کا کوئی اور آپ سے پہلے کہہ چکا ہے۔" مجھے جواب ملا۔

وہ جگہ مجھے اتنی پسند آئی تھی' اور اب کوئی اور ادھر ہوٹل یا کچھ اور بنائے گا' یہ مجھے گوارا نہ تھا۔

"کون ہے وہ' جس نے یہ جگہ خریدنے کو کہا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک ڈویلپر ہے' شیخ جہانگیر۔"

"کتنی قیمت لگائی تھی اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"دو ملین پاؤنڈز۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"میں تین ملین دوں گا۔ ابھی اور اسی وقت فائنل کرو۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یس سر!" اس نے پلکیں جھکائیں۔

مجھے شیخ جہانگیر کو ہرانے کی اتنی خوشی تھی کہ رات میں سونیا' مومنہ اور سجل کو باہر ڈنر پر لے گیا۔ woodlane's سے ڈنر کرنے کے بعد جب میں واپس آیا تو ایک کال میری منتظر تھی۔

"ہیلو!" میں نے قدرے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"میں جہانگیر بات کر رہا ہوں اس دفعہ تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے' کیونکہ ابھی تم بچے ہو' نا سمجھ ہو' لیکن اگلی بار میرے راستے میں مت آنا۔ سمجھے؟" دوسری طرف سے دانت پیستے ہوئے لہجے میں کہا گیا تھا۔

"سمجھ گیا!" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو دوسری جانب سے غصے میں فون کھٹاک سے رکھ دیا گیا۔ میں دل کھول کر ہنسا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک بلڈنگ ڈویلپر کے ساتھ مل کر میں نے یہ نیا پروجیکٹ شروع کیا۔ اس پر قریباً" دس کروڑ پاؤنڈز کا خرچہ آنا تھا۔

مجھے رئیل اسٹیٹ کا کوئی تجربہ تھا نہ ہی مجھے ڈویلپر بننے کا کوئی شوق تھا۔ (آسان لفظوں میں ڈویلپر زوہ ہوتے ہیں جو خالی ہاتھ' دوسروں سے قرضہ مانگ کر بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہیں' جو پانچ دس سال بعد ان کی ہو جاتی ہیں۔ بینک سے قرضہ لیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ عمارت کی تعمیر کی مدت صحیح طور پر تجویز کر کے ڈیڈ لائن رکھی جائے۔ جو ڈیڈ لائن بینک دیتا ہے' اس تک اگر عمارت نہ بنے تو ڈویلپر دیوالیہ ہو جاتا ہے۔

بینک سے ڈیڈ لائن 2002 کے فروری تک کی تھی۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پروجیکٹ بھی کافی مشکل تھا۔ خیر' اللہ اللہ کر کے کام کا آغاز ہوا۔ نقشہ ہر جگہ سے اوکے ہونے کے بعد فائنل ہو گیا تو تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

اس دوران میں نے مانچسٹر میں دو ہونٹلز خرید لیے اور معمولی ردوبدل کے بعد انہیں بھی شروع کر دیا۔ میرا کاروبار بہت اچھا جا رہا تھا۔ یہ سب سمل کے لیے تھا۔

اسی سال' میں اپنی بہنوں کو گھمانے پھرانے لندن لے آیا۔

جہاں لندن کا نام آجائے' وہاں تھیٹر' میوزک کنسرٹس اور آرٹ کا خیال خود بخود ذہن میں ابھرتا ہے۔ اس معاملے میں یہ شہر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ اولڈ بک اسٹورز پسند آئے۔ میں پورا پورا دن Hatchard's اور Foyle پر کھڑا کتابیں خرید تا رہا۔ Harrods فورٹنم اینڈ میسن اور مارکس اینڈ اسپنسر سے شاپنگ کرنے کے علاوہ میری بہنوں کو لندن میں کوئی خاص دلچسپ چیز نظر نہیں آئی۔

لندن میں اتوار کو دریائے ٹیمز کے کنارے کھلی فضا میں پینٹنگز کی نمائش ہوتی ہے۔ وہاں پر درجنوں مصور

www.Paksociety.com

اپنی تصاویر کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ ناکام آرٹسٹ تھے جن کی بوگس تصاویر کو کسی گیلری میں جگہ نہ مل سکی تھی۔ ترس کھا کر میں نے ایک تصویر خرید لی۔

"بھائی آپ اسے کہاں لگائیں گے؟" ... نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"کسی کو بھیجنی ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اگلے روز میں نے وہ پینٹنگ شیخ جہانگیر کو بھجوا دی۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔

"سوائے" کی اسپیشل سنڈے ٹی پینے کے بعد مومنہ اور سونیا کو میں نے chadwick's پر چھوڑا، جبکہ خود سجل کے ساتھ ونڈسر کا قلعہ دیکھنے چلا گیا۔ اس کے بعد ہم ہیمپٹن کورٹ اور کنٹربری گئے۔ کنٹربری کا کیتھیڈرل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

سجل گھوم پھر کر پوری جگہ دیکھ رہی تھی، جبکہ میں ایک جگہ بیٹھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دور ایک کونے میں سر گھٹنوں میں دیے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں سے نیچے آ رہے تھے۔ خوامخواہ ہی مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔

"پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گا جو وہ یوں بیٹھی ہے۔" میں نے آزردگی سے سوچا۔

کچھ دیر بعد اس لڑکی نے سر اٹھایا۔

میں اسے دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔

عام سی بلیو جینز کے اوپر سیاہ شرٹ پہنے، بنا کسی میک اپ کے اس بہت حسین لڑکی کو ساڑھے تین برس بعد میں نے دیکھا تھا۔

وہ ماہ نور جہانگیر تھی۔

اس کو دیکھ کر مجھے وہ ڈیڑھ مہینہ یاد آ گیا جب میں اور سمل باقاعدگی سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اس لمحے مجھے بیتے دن بہت یاد آئے۔ سمل کی یاد کبھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی تھی۔

میری ہر بے سکون اور بے چین رات میں وہ میرے ساتھ تھی، میرے ہر مصروف دن میں وہ میرے ہمراہ تھی۔ اور میں اسے بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

اس لمحے ماہ نور جہانگیر کو دیکھ کر میرے اندر سمل کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ کہاں ہو گی، کیسی ہو گی؟ کیا وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو گی؟

بے اختیار ہی میں اٹھا اور ماہ نور کی جانب بڑھ گیا۔ ماہ نور کو دیکھ کر مجھے ایک دم شاک لگا تھا۔ وہ کافی بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اس کے بال اب کافی لمبے اور بغیر کسی ڈائی کے تھے۔ اس کے کپڑے بہت عام تھے۔ وہ لڑکی جو گوچی اور ورسیانو سے کم کچھ نہیں پہنتی تھی، شنیل کے پرفیوم مزرگاتی تھی، Briony's (لندن) سے بال کٹوائی تھی، امپورٹڈ کاسمیٹکس استعمال کرتی تھی، وہ اب اتنی الجھی الجھی اور مضمحل کیوں لگ رہی تھی؟

"ماہ نور!" اس کے قریب جا کر میں نے اسے پکارا۔

وہ بری طرح چونکی۔ "آ... آپ؟"

"ہاں میں! خرم۔" میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہاں شور بہت تھا، بمشکل ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میں ادھر ہی ہوتا ہوں!"

"لندن میں؟"

"نہیں۔ مانچسٹر میں۔"

"کیسے ہیں آپ؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ سمل کیسی ہے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"جی؟" وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

"سمل کیسی ہے؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اب وہ مجھے الجھن بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ سمل کیسی ہے؟"

"ہاں!" میں نے متذبذب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم اس کی بہن ہو، اس کے ساتھ رہتی ہو! تم ہی سے پوچھوں گا۔"

"آپ کو..... آپ کو کچھ نہیں پتہ؟" وہ انگلیاں مسلنے لگی۔

"کیا نہیں پتہ؟" میں پریشانی سے پوچھنے لگا۔ یکبارگی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"آپ سمل سے آخری بار کب ملے تھے؟"

"جب اس نے مجھے گھر بلایا تھا۔ 7 مارچ تھی۔" میں اچھنبے سے بولا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "یعنی آپ کو کچھ نہیں پتا۔"

"نہیں..... پلیز بتاؤ نا، کیا ہوا سمل کو؟" میرا دل

کیوں کیوں ہو رہا تھا۔

"آپ، آپ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ بہت دل برداشتہ تھی۔ اس سے آپ کی بے وفائی برداشت نہ ہو سکی اور..." ماہ نور اب آنسو روکنے کے لیے نچلا لب کاٹ رہی تھی۔

"کیا کیا اس نے؟ بتاؤ نا نور؟" میں چیخ پڑا، مگر میری چیخ کیتھیڈرل کی دیواروں میں ہی گم ہو کر رہ گئی۔

"آپ کے جانے کے فوراً بعد۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ "سمل نے..... سمل نے خودکشی کر لی۔ اس کو مرے ہوئے تین سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ اس کو ہم سب نے بہت دکھ دیے تھے۔ میں نے بہت برا کیا تھا اس کے ساتھ، اور، اور آپ نے بھی بہت برا کیا تھا۔ آپ اس کو چھ..... چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ساری زندگی اس کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی۔ اب وہ اور کیا کرتی۔ ڈیڈ یا ممانے کبھی اس کو بیٹی نہ سمجھا تھا۔ حالانکہ وہی اچھی بیٹی تھی۔"

ماہ نور اب سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے کیتھیڈرل کی دیواریں میرے اردگرد تنگ ہو رہی ہوں۔ فضا سے آکسیجن ایک دم ہی ختم ہو گئی تھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ چھت زمین کے قریب آ رہی تھی۔ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

جس ایک شخص کے لیے آپ کئی برس محنت کرو، اور وہ ہی نہ رہے تو کیسا لگتا ہے۔ میں تو ستاروں سے بھی آگے جانا چاہتا تھا۔ مگر کس کے لیے؟

اس کے لیے جو مر چکی ہے؟ جو اس دنیا میں ہے ہی نہیں، جو میری ہی وجہ سے حرام موت مرنے پر مجبور ہو گئی؟ مگر سمل تو ایسی نہ تھی۔ وہ کیسے مر سکتی ہے؟ وہ کیسے مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے؟

تو کیا تم واقعی چلی گئیں سمل؟ مجھ سے روٹھ کر، منہ موڑ کر، تم اس دنیا سے چلی گئیں۔ کیا تم اتنی سخت ناراض ہو گئی تھیں کہ سب سے ناتا توڑ کر چلی جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو؟ مگر میں تو تمہارا واحد دوست تھا۔ تمہاری طرح اکیلا تھا، بچپن سے محروم تھا۔ ہم دونوں تو ایک جیسے تھے۔ میں تو تمہارا سب کچھ تھا! اور تم، تم مجھ ہی سے ناراض ہو گئیں؟ تمہیں میرا ہی اعتبار نہ رہا تم مجھے لالچی سمجھتی رہیں؟ کیوں سمل؟ کیوں؟

اگر میں لالچی ہوتا تو تمہارے بجائے ماہ نور سے محبت کا ڈھونگ رچاتا۔ اگر میں حسن پرست ہوتا، تو تمہارے بجائے ماہ نور کو پسند کرتا، مگر میں تو تمہارا طالب تھا سمل! تمہیں ہی چاہتا تھا۔ تم خود کو بہت بدصورت سمجھتی تھیں، تم نے کبھی اپنے آپ کو میری آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ پاتیں، تو تم تو دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی تھیں۔

کاش میں تمہیں اپنے جانے کی وضاحت دے کر جاتا۔ مگر سمل میں لفظوں سے نہیں عمل سے اظہار کرنا چاہتا تھا۔

تمہارے باپ کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتا تھا تاکہ وہ بخوشی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیں۔ مجھے شیخ جہانگیر کی دولت سے کوئی غرض نہ تھی، میں تو تم سے محبت کرتا تھا۔ سچی محبت! صرف تم سے، سمل جہانگیر۔

مجھے جب بھی کوئی کامیابی نصیب ہوئی، مجھے تم یاد آئیں۔ اپنی ہر خوشی پر مجھے اپنے اردگرد تمہاری موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ فضا میں تمہاری خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ تاریک رات میں تمہاری محبت کے جگنو دکھائی دیتے تھے۔ مگر تم تو تھیں ہی نہیں۔

تو کیا میں سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ اس اندھی سڑک پر کسی بے منزل مسافت کا مسافر تھا؟ صحرا میں سورج کی تپش کو آب حیات سمجھ کر اس کی جانب دوڑ رہا تھا؟ پچھلے ساڑھے تین برس تک خود کو تھکا دینے والی ذہنی اور جسمانی اذیت اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لیے دے رہا تھا جو درحقیقت، اسی لمحے، اسی پل ختم ہو گیا تھا، جب میں تمہارے گھر سے لوٹا تھا۔ تم مر گئیں تم نے میری اس بے وفائی کو دل سے لگا کر موت قبول کر لی جو میں نے کی ہی نہیں تھی۔ تم نے میرے انکار کو لالچ سمجھا تم میری وجہ سے مر گئیں سمل!

میں تو اس راہ پر تمہارے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے نکلا تھا، مگر اپنی محبت کے جگنو ہی کھو بیٹھا۔

ماہ نور کی سسکیوں کی آواز کہیں دور ... سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

ماہ نور کے بارے میں سمل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت بہادر ہے، بڑی سے بڑی بات بھی ہو جائے، وہ نہیں روتی۔ لیکن اس وقت وہی ماہ نور بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہی

www.Paksociety.com

تھی۔ سمل کو مرے ہوئے ساڑھے تین برس ہو گئے تھے مگر اس کے انداز سے لگتا تھا کہ جیسے وہ آج مری ہو۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟" میری آواز رندھی ہوئی تھی۔

"میں، میں بہت ڈپریسڈ تھی۔ اس لیے ادھر آ گئی۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "آپ پاکستان سے یہاں کب آئے؟"

"97ء کے مئی میں۔"

"اس کے بعد واپس نہیں گئے؟"

"نہیں۔" میں نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ اس وقت تفصیلات بتانا میرے بس میں نہ تھا۔

"باہر چلیں؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی میں نے اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اب وہ ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں صاف کر رہی تھی، میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں اکٹھے باہر آ گئے۔ ماہ نور نے ایک لمحے کو پیچھے کیتھیڈرل کی پتھروں سے گھری عمارت پر الوداعی نگاہ ڈالی اور پھر تیز تیز قدموں کے ساتھ لش گرین گھاس پر چلنے لگی۔ وہ تیز چل رہی تھی۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ رک گئی اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"میری بہن اندر ہے۔ تم جاؤ، میں بعد میں جاؤں گا۔" میری آواز بہت دھیمی تھی۔ پتہ نہیں وہ سمجھی بھی تھی یا نہیں، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گئی۔

"بھائی!" سجل شاید پیچھے سے مجھے پکار رہی تھی۔ مجھ سے سر نہیں موڑا گیا۔ اس وقت مجھ سے کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دماغ بری طرح ماؤف ہو گیا تھا۔

"بھائی۔" وہ اب میرے قریب آ گئی۔ "میں آپ کو اندر ڈھونڈ رہی تھی۔ چلیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی، مگر میں سن نہ سکا۔

پارکنگ ایریا کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہ فٹ پاتھ پر تصویر بناتے ایک بوڑھے فٹ پاتھ آرٹسٹ پر پڑی۔ وہ کافی انہماک سے مختلف رنگوں کو زمین پر بھر رہا تھا۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ آسمان سے گرتی پانی کی بوندوں نے اس کی تصویر کو بھی نہیں بخشا۔ وہ معمر آدمی بے چارگی سے ایک طرف کھڑا اپنی کئی گھنٹوں کی محنت سے بنی تصویر کو مٹتے دیکھنے لگا۔ فٹ پاتھ پر موجود دلفریب رنگوں کو بارش کے پانی نے صاف کر کے زمین کی خوب صورتی ختم کر دی تھی۔

جس طرح میری زندگی سے رنگ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

پہلے وہ سب کچھ سمل کے لیے تھا۔ اب وہ بھائی بہنوں کے لیے تھا۔ میرے اپنے لیے نہ پہلے کچھ تھا اور نہ اب کچھ۔

ایک مشین بن کر میں نے اپنی تمام توانائیاں [illegible] بزنس کے لیے وقف کر دیں۔ ماہ نور نے کہا تھا، سمل مری ہے۔ وہ مری نہیں تھی۔ وہ اب بھی زندہ تھی میری یادوں، میرے خیالوں، میری سوچوں اور خوابوں میں

دنیا نئی صدی میں داخل ہونے کے قریب آ رہی تھی،

اور میری منزل قریب آ رہی تھی۔

بارہ سال کی عمر میں ہونٹز کی چین بنانے کا دیکھا گیا خواب اب خواب نہیں رہا تھا۔ خواب تو وہ ہوتے ہیں، جن سے خوشی اور امیدیں وابستہ ہوتی ہیں، خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھی گئی ان خوشیوں کا نام ہے جو حقیقت میں نہیں ہوتیں۔ خواب تو امید ہوتے ہیں، اچھے وقت کی، اچھے مستقبل کی، اچھی زندگی کی، خواب محبت سے عبارت ہوتے ہیں۔ میری محبت مجھ سے دور چلی گئی تھی، سو میرا خواب، خواب نہیں ڈیوٹی بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے اب اپنی بہنوں کے لیے یہ ڈیوٹی پوری کرنی تھی۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، مانچسٹر میں میرے سیون اسٹار ہوٹل کی تکمیل کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔ یہ جگہ میں نے شیخ جہانگیر کے ہاتھوں سے چھینی تھی۔ شیخ جہانگیر، جنہیں رئیل اسٹیٹ کا جائنٹ کہتے تھے۔ اس جگہ وہ کوئی شاپنگ پلازہ تعمیر کرانا چاہتے تھے۔ اب جب میرا ہوٹل بنے گا تو ان کے دل پر کیا گزرے گی، یہ سوچ کر ہی مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔

اس روز میرے پارٹنر نے مجھے فون کر کے سائٹ پر بلایا۔ وہ کسی گڑبڑ کا کہہ رہا تھا۔ میرے پہنچنے پر اس نے مجھے اشارتاً خاموش رہنے کا کہا۔ وہ شاید ٹھیکیدار کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے ہوٹل کی نامکمل عمارت کے سامنے کھڑے ٹرکوں کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

"ہم نے جن شیشوں کا آرڈر دیا تھا، وہ آج آ گئے ہیں۔"

"تو مسئلہ کیا ہے؟"

"ہم نے ٹنٹڈ گلاس Tinted glass کا آرڈر دیا تھا۔ لیکن جو شیشہ ہمیں ملا ہے، اس کا Tint بھی نامناسب ہے اور کٹاؤ بھی غلط ہے۔ یہ ہماری بلڈنگ کی کھڑکیوں پر جچے گا نہیں۔"

"اس سے ہوٹل کی کنسٹرکشن پر کتنا اثر پڑے گا؟"

"اگر ایک ہفتے تک شیشہ مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"تم نے یہ معاملہ ٹھیکے دار سے ڈسکس کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں سب سے پہلے تمہیں بتانا چاہتا تھا۔"

"فی الحال تم کسی کو بھی نہ بتاؤ، مزدوروں سے کہو اس شیشے کو ہاتھ بھی نہ لگائیں۔ میں اس کا حل سوچتا ہوں۔ شاید آرڈر غلط لکھا گیا تھا۔" میری بات سن کر اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"میرا نہیں خیال خرم! کہ آرڈر غلط لکھا گیا ہے۔"

"پھر؟"

"میرا خیال ہے، کسی نے آرڈر غلط لکھوا کر دشمنی نکالی ہے۔"

"مگر میری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"کچھ competitors ایسے کرتے ہیں۔"

"اچھا، میں اس گلاس کمپنی کو دوبارہ آرڈر....."

"کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے یہ شیشے چھ ماہ پہلے آرڈر کیے تھے۔ اگر تم ابھی آرڈر کر بھی دو، تو تین ماہ سے زیادہ کے عرصے میں ہمیں ہمارا مطلوبہ آرڈر ملے گا۔"

"تو؟"

"تو یہ میرے بھائی کہ بینک سے ڈیڈ لائن اگلے سال کی 31 جنوری تک ہے۔ آج 16 ستمبر ہے۔ اگر 16 دسمبر کو ہمیں شیشہ ملے تو ہم اسے لگائیں گے کب؟"

"میں، میں کچھ کرتا ہوں۔" میں جانے کے لیے مڑا۔

"خرم!" اس کی آواز پر میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"خرم اگر ایک ہفتے تک ہمیں شیشے نہ ملے تو ہم دیوالیہ ہو جائیں گے۔ یہ دس کروڑ پاؤنڈز کا پروجیکٹ ہے۔"

میں تاسف سے سر ہلاتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگر ایک ہفتے تک شیشے نہ ملے تو.....؟ یہ سوال میرے ذہن میں پچھلے آدھے گھنٹے سے گردش کر رہا تھا۔ میں نے بالآخر ٹھیکیدار کا نمبر ملایا۔

"فوسٹر! ہم نے شیشے کس گلاس کمپنی سے خریدے ہیں؟" بغیر سلام دعا کے میں نے پوچھا۔

"اینگلو ٹنک پینل اینڈ گلاس کمپنی۔"

"پتہ کرو، یہ کس کی ہے؟" اتنا کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

تقریباً" پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے تیزی سے لپک کر اسے اٹھا لیا۔

"سر! وہ کمپنی تین برس پہلے ایس جے انٹرپرائزز نے خریدی ہے۔"

"اور ایس جے انٹرپرائزز کس کی ہے؟"

"سر، ایس جے انٹرپرائزز شیخ جہانگیر کی ہے۔"

میں نے فون رکھ دیا۔

لندن انکوائری سے شیخ جہانگیر کے لندن آفس کا نمبر لے کر ڈائل کیا تو وہ وہاں نہیں تھے۔ وہ دبئی اپنے ہیڈ آفس میں تھے۔

تقریباً" بیس منٹ بعد میرا ان سے دبئی میں رابطہ ہو گیا۔ ڈیڑھ منٹ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد ان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"جہانگیر اسپیکنگ!"

"میں خرم بات کر رہا ہوں۔ خرم زید۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کون خرم زید؟" وہ مصروف لہجے میں بولے۔

"وہی خرم زید جس نے مانچسٹر میں ومنرلو روڈ والی زمین آپ کے ہاتھوں سے چھینی تھی۔" دوسری جانب چند ساعتوں کی خاموشی چھائی رہی۔ پھر ان کی آواز ریسیور میں ابھری۔

"ہوں..... پھر؟"

"پھر یہ مسٹر جہانگیر! کہ بزنس میں رقابت چلتی ہے، مگر دھوکا نہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"میں نے کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا زید!" وہ آرام سے بولے "تمہیں وہ زمین چاہیے تھی سو مل گئی، میں تو اس بات کو بھول بھی چکا تھا۔"

www.Paksociety.com

"اینلا ٹنگ پینل اینڈ گلاس کمپنی آپ کی ہے؟"

"آں..... ہاں کیوں؟" ان کا لہجہ اب الارمنگ تھا۔

"آپ اس کو دھوکا نہیں سمجھتے مگر میرے نزدیک غلط مال سپلائی کرنا دھوکا ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

غصّے سے میرا برا حال تھا۔ مقابلہ اپنی جگہ' مگر کسی کو بالکل تباہ کردینا کہاں کی انسانیت ہے؟

آج سے ٹھیک دس برس پہلے' جب شیخ جہانگیر کی بیٹی ماہ نور جہانگیر نے مجھے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے اس نوکری سے دھکے دے کر نکلوایا تھا جس کی مجھے اشد ضرورت تھی اور آج' آج اس کے باپ نے بھی میرے ساتھ ویسا ہی کیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں ٹھیکے دار فوسٹر سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"تم کنسٹرکشن سائٹ پر گئے؟" میں نے پوچھا۔

"نو سر!"

"کام ہو رہا ہے؟"

"یس سر!"

"ایسا کرو' مزدوروں سے کہو ابھی شیشوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔"

"سر' یہ آڈر مسٹر ولس پہلے ہی دے چکے ہیں۔" اس نے میرے پارٹنر کا نام لیا۔

"اور کچھ کہا مسٹر ولس نے؟"

"نو سر!" وہ رکا اور قدرے توقف سے بولا۔ "اگر ہم ان ہی شیشوں کو استعمال کرلیں تو.....؟"

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "شاید یہ نہ ہوسکے۔"

"اتنا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ ان کا کٹ اور tint دونوں غلط ہیں۔"

"میرے پاس ایک حل ہے' تم سائٹ پر پہنچو' میں بتاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نے فون رکھ دیا اور آفس سے نکل آیا۔

جاتے وقت البتہ میں اپنی سیکرٹری کو دبئی کے لیے سیٹ بک کروانے کا کہنا نہیں بھولا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ میرے سائٹ پر پہنچنے کے دس منٹ بعد ہی وہاں آ گیا۔

"پھر سر! کیا حل ہے آپ کے پاس؟" وہ پوچھنے لگا۔

"تم نے شیشے دیکھے ہیں؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"نہیں سر' ابھی تو موقع نہیں ملا۔"

"موقع ملے گا بھی نہیں۔"

"کیوں سر؟"

"بی کوز یو آر فائرڈ۔" (کیونکہ میں نے تمہیں فارغ کر دیا ہے)

"جی؟" وہ حیران سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

تقریباً" ایک سال پہلے اس کی لاپروائی سے بلڈنگ میں آگ لگتے لگتے بچی تھی۔ اس بات پر میں نے اسے تھپڑ دے مارا تھا اور بہت بے عزتی بھی کی تھی۔ اس بے عزتی کا بدلہ اس نے اپنے بھائی رابن فوسٹر' جو اینلا ٹنگ پینل اینڈ گلاس کمپنی کا منیجر تھا' کی مدد سے مجھ سے لیا تھا۔

میں نے ولس کو منع کیا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ فوسٹر کہہ رہا تھا اسے ولس نے کچھ نہیں بتایا' پھر اس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ شیشوں کا tint اور cut غلط ہے؟ ظاہر ہے' اس نے غلط شیشے آرڈر کیے تھے یا پھر آرڈر بعد میں تبدیل کروادیا تھا۔

میں نے اسے پولیس کے حوالے کردیا مگر اس طرح نقصان پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے جتنی بھی گلاس کمپنیز کو فون کیا' شیشوں کی ڈلیوری کی مدت کم از کم بھی دو ماہ سے کم نہ تھی۔

دو روز بعد کی میری دبئی کی فلائٹ تھی۔ مجھے شیخ جہانگیر سے اپنے رویے کی معافی مانگنا تھی۔

دبئی جانے سے ایک روز پہلے ہی شیخ جہانگیر نے مجھے میرے مطلوبہ شیشے بھجوادیے۔ اس روز کے بعد ہی میں نے رئیل اسٹیٹ سے توبہ کرلی۔

☆ ☆ ☆

ایس جے انٹرپرائزز کا ہیڈ آفس دبئی میں بنی یاس روڈ پر واقع تھا۔ نیلے شیڈز کے شیشوں سے اس بیس منزلہ عمارت کا بیرونی حصّہ ڈھکا ہوا تھا۔ شیخ جہانگیر کا اپنا آفس ٹاپ فلور پر تھا۔

ان کی سیکرٹری نے مجھے بغیر ایک لمحے کے توقف کے اندر بھیج دیا۔ وہ میری آمد سے باخبر تھے۔

ہلکی سی دستک دے کر میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ ان کا آفس بہت وسیع اور لیوشلی ڈیکوریٹڈ

www.Paksociety.com

تھا۔ گرے اور اسٹیل کلر کی تھیم میں پورا کمرہ ڈیزائن کیا گیا تھا۔ آفس چیئرز، صوفہ سیٹ، پردے، کارپٹ اور وال پیپر سب کچھ نہایت نفاست سے اتھی رنگوں سے سجایا گیا تھا۔ ان کے ٹیسٹ کا اندازہ میں دیواروں پر لگی پینٹنگز سے کر سکتا تھا۔

غالباً" ان کو فیلمش پینٹرز بہت پسند تھے۔ کیونکہ زیادہ تر فیلمش آرٹ ہی کمرے کی دیواروں کی زینت بنا ہوا تھا۔ بالکل ساتھ ایک کافی چیپ سی پینٹنگ لگی تھی۔ اتنی خوب صورت کولیکشن کے ساتھ ایک فضول پینٹنگ لگانے کا مقصد مجھے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے ان کو اخبارات میں ہی دیکھا تھا۔ کبھی کسی پروجیکٹ کا افتتاح کرتے ہوئے، کبھی کسی کنگ کے ساتھ کبھی کسی پریزیڈنٹ کے ساتھ ڈنر کے موقع پر، کسی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے شیخ جہانگیر ملٹی ڈائمینشنل پرسنالٹی کے مالک تھے۔ رسائل و اخبارات میں وہ اتنے ہینڈسم اور گریس فل نظر نہیں آتے تھے، جتنے حقیقت میں تھے۔ سیاہ رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ان کی شخصیت اور بھی زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر ایک نرم سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھے اور کافی گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔

"کیسے ہو ینگ مین؟"

"فائن سر!" میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ان کی آنکھیں بالکل سمل جیسی تھیں۔ گہری اور سیاہ، جبکہ باقی نقوش ماہ نور والے تھے۔ خوب صورت اور دلکش۔

مجھے اپنے رویے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ خوامخواہ ہی میں نے ان سے اتنی بدتمیزی سے بات کی، ان کو مورد الزام ٹھہرایا، جبکہ انہوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دن بعد ہی میرے مطلوبہ شیشے بھجوا دیے۔ پتہ نہیں انہوں نے اتنے زیادہ شیشوں کا انتظام ایک ہی دن میں کیسے کیا ہوگا؟

"کیا پیو گے؟ چائے، کافی یا ٹھنڈا؟" وہ بہت دوستانہ انداز میں پوچھنے لگے۔

"بلیک کافی، چینی کے بغیر۔" انہوں نے میرے جواب پر ریسیور اٹھایا اور دو بغیر چینی کے بلیک کافی کا آرڈر دیا۔

"تو مسٹر زید! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔

"سر! میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے اپنے رویے کی معافی مانگنے آیا ہوں۔" میں خفیف سے لہجے میں بولا۔

"معافی مانگنے آئے ہو۔ مگر ابھی تک مانگی تو نہیں۔" ایک لے کو رک کر انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھے پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ "جسٹ کڈنگ۔"

اتنے میں کافی آگئی۔

ملازم کے جانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

"جس طرح تم نے مجھ سے بات کی، کوئی اور کرے تو میں منہ توڑ دیتا ہوں لیکن۔" وہ مسکرائے۔ "تم اپنے شہر کے ہو، اس لیے بچ گئے۔"

ان کو معلوم تھا کہ میرا تعلق اسلام آباد سے ہے۔

"غلطی تمہاری نہیں تھی۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"تمہارے کنٹریکٹر نے ہی گڑبڑ کی تھی۔ اس کے بھائی نے اوریجنل آرڈر کو چینج کر دیا تھا۔ لیکن میں نے پھر بھی شیشے بھجوا دیے، تاکہ تمہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"آپ چاہتے تو نہ بھی بھجواتے، پھر بھی آپ نے بھجوا دیے، کیوں؟"

"میں نے کہا نا زید! تم اپنے شہر کے ہو۔"

"اٹس خرم!" میں نے اپنا پسلا نام لینے پر زور دیا۔

"رائٹ، خرم..... اس کا مطلب ہوتا ہے۔" "ہیپی مین لیکن تم تو شکل سے....." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"میں شکل سے کیا؟"

"ڈیوڈ بیکہم لگتے ہو۔"

"آپ نے بیان بدلا ہے۔"

"اوکے! میں کہہ رہا تھا، مغرور لگتے ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "مجھے پتہ تھا۔"

"ویسے بیکہم بھی لگتے ہو۔"

"میں اس سے بہتر ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"شکل میں؟" انہوں نے ابرو اچکائی۔

"شکل میں بھی اور گیم میں بھی۔"

"یو آر اے فٹ بالر؟" وہ حیران ہوئے تھے اور متاثر بھی۔ "رئیل میڈرڈ کے لیے کھیلتے ہو؟"

"نہیں، ہیڈ نگلے کے لیے۔ کبھی کبھی وہ بلا لیں تو کھیلتا ہوں، ورنہ کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ....." میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پتہ ہے تم کیا ہو؟" میرا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے۔

"آپ بتائیں!"

"ہینڈسم، مغرور، ایمبیشس روڈ اور فٹ بالر۔"

"اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں بس فٹ بالر نہیں ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے اور وہ صحیح کہہ رہے تھے۔

میری طرح وہ بھی صاف گو، ڈیشنگ اور سیلف میڈ انسان تھے۔

ان کی ناک بھی میری طرح کھڑی تھی، جس کی وجہ سے وہ مغرور دکھتے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک بے ساختہ پن تھا جو سمل کے چہرے پر میں نے دیکھا تھا۔ چال ڈھال اور ہر انداز و اطوار سے ان میں وقار جھلکتا تھا۔ یہ خصوصیت سمل میں تھی، مگر اس کے انداز میں عجز کا عنصر بھی تھا، جبکہ شیخ جہانگیر کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ بالکل میری طرح۔

خفت مٹانے کے لیے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا نگاہیں بے اختیار ہی اس نامناسب پینٹنگ پر مرکوز ہو گئیں جو شیخ جہانگیر جیسے آرٹ لور کے کمرے میں لگی تھی۔

"پینٹنگ دیکھ رہے ہو؟ پسند آئی، یہ بیچ والی؟"

"سچ پوچھیں تو نہیں۔" میں فوراً" بولا۔

"ایک دوست نے تحفے میں دی تھی۔" وہ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے بولے۔ "دراصل مانچسٹر میں، میں نے ایک جگہ دیکھی تھی، ڈیل بھی تقریباً" مکمل ہو گئی تھی، مگر پھر معلوم ہوا کہ ایک لڑکا لے اڑا ہے۔ اسی نے بھجوائی تھی۔"

مجھے سخت احساس شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ تصویر میں نے ہی ان کو، لندن سے نیمز کے کنارے ایک ناکام آرٹسٹ سے خرید کر بھیجی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اسے آفس میں لگا لیں گے۔ تھوڑا سا جھینپ کر میں نے انہیں دیکھا۔

"اٹس اوکے ینگ مین!" وہ رسانیت سے بولے۔ "پاکستان گئے ہو کبھی؟"

"میں برٹش نیشنل ہوں، برٹش بورن نہیں۔ زندگی کے 23 سال پاکستان میں گزارے ہیں۔ پانچ برس پہلے لیڈز آیا تھا۔"

"کوئی رشتہ دار ہے لیڈز میں؟"

"رشتہ دار تو نہیں، مگر ایک صاحب ہیں، بلال احمد، ان کی فیملی سے اچھے تعلقات ہیں۔"

"وہ کیا کرتے ہیں؟"

"ہوٹیلیئر بھی ہیں اور پراپرٹی کے بزنس میں بھی ہیں۔" میں بتانے لگا "لیڈز اور بریڈفورڈ میں ان کے ہوٹلز ہیں۔ ایک ہوٹل دبئی میں بھی ہے۔"

"دبئی میں؟ کیا نام ہے؟"

"ٹال ٹریز۔"

"تم عماد کے انکل کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں عماد کو؟" میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، عماد آج کل دبئی میں ہی ہوتا ہے۔ میں دو روز پہلے ملا تھا اس سے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے؟" شاید غائب دماغی میں، میں نے یہ سوال کیا تھا۔

"ایک بیٹی ہے۔" ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"لیکن میں نے تو سنا تھا، آپ کے دو بچے ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں..... دو بیٹیاں تھیں۔ مگر اب صرف ایک ہے۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"اور دوسری؟" جانتے ہوئے بھی میں یہ سوال کر رہا تھا۔

"وہ، وہ مر چکی ہے۔" ان کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

"اوہ آئی ایم سوری۔" بہت مشکل تھا یہ سب کچھ کہنا میرے لیے۔ اس لڑکی کی موت پر افسوس کرنا، جو میری زندگی تھی..... میرا سب کچھ تھی..... میری محبت تھی۔

اچانک ان کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر موجود نمبر دیکھ کر انہوں نے فون فوراً" کان سے لگا لیا۔

"ہیلو..... ہاں! بیٹا کیوں کیا ہو گیا؟ جتنے پیسے چاہئیں واپس آکر لے لو۔ میں گاڑی بھیجوں یا..... اچھا ٹھیک ہے، ہاں تم آجاؤ۔ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔ ایک زبردست شخصیت میرے سامنے موجود ہیں۔" وہ ہنسے۔ "نہیں نہیں تم ملو گی تو ہالی وڈ اسٹارز کو بھی بھول جاؤ گی۔ ہاں بھئی، کافی ہینڈسم ہے اوکے آل رائٹ! جلدی سے آجاؤ۔" انہوں نے موبائل بند کر دیا۔

"میری بیٹی تھی۔ ابھی آتی ہے تو ملواتا ہوں۔"

"سر! ایسا ہے کہ میں چلتا ہوں۔ میں نے کسی کو ٹائم دے

www.Paksociety.com

رکھا ہے۔" میں اٹھتے ہوئے بولا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ماہ نور وہاں آئے اور جہانگیر کے سامنے ماضی کا کوئی ذکر چھیڑے۔

مصافحہ کرتے ہوئے میں نے اردو میں کہا۔ "انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔" اس سے پہلے ہم تمام بات چیت انگریزی میں کر رہے تھے۔ میری اردو سن کر وہ تھوڑے حیران ہوئے، پھر مسکرا کر بولے۔

"مجھے بہت کم لوگ متاثر کرتے ہیں، اور تم ان میں سے ایک ہو۔" ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

کھلے دروازے پر میں نے زور سے دستک دی۔ کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلاتے عماد نے ایک لحظے کو رک کر میری طرف دیکھا، پھر دوبارہ کام میں مگن ہو گیا۔

"اندر آجاؤں؟" میں نے باآواز بلند اجازت طلب کی۔

"اوں ہوں نہ!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"اتوار کو آنا۔ چھٹی ہوتی ہے، میں فقیروں کے لیے ٹائم نکال لوں گا۔"

"میں تمہیں فقیر نظر آتا ہوں؟" مصنوعی غصے سے کہتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔

"جس طرح تم اجازت مانگ رہے ہو، اس طرح تو فقیر بھی نہیں مانگتے۔ بلکہ ہمیں ہی ان سے معافی مانگنی پڑتی ہے۔" اب کے وہ قدرے بگڑ کر بولا۔ "تمہیں میرے آفس میں آنے کے لیے اجازت کی ضرورت ہے بھلا؟" اس کا اپنائیت بھرا لہجہ میرے دل کو چھو گیا تھا۔

"اچھا بابا آگیا ہوں اندر!" میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ادھر یو اے ای کب آئے؟" وہ کام چھوڑ کر پوچھنے لگا۔

"صبح پہنچا تھا۔ ایک میٹنگ تھی، اسی سلسلے میں آیا تھا۔"

"سنو۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔ "پرسوں میں شیخ جہانگیر سے ملا۔ جانتے ہو انہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ ان کی بیٹی تھی۔ سچ خرم! اتنی کیوٹ اور سوئیٹ تھی کہ میں تو بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔"

"ہاں، وہ شکل کی اچھی ہے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"صرف اچھی؟ وہ تو بہت پیاری ہے۔ اس کے بال بھی بہت لمبے اور خوب صورت تھے۔" وہ بتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کینیڈر بری میں جب نے ماہ نور کو دیکھا تھا تو اس کے بال بہت لمبے تھے اور اس نے انہیں ڈائی بھی نہیں کیا ہوا تھا۔ عماد اسے نائس اور سوئیٹ کہہ رہا تھا کیا ماہ نور واقعی بدل گئی تھی؟۔

نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ جتنا میں ماہ نور سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں، قدرت کسی نہ کسی طرح اس کو پھر میرے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟

عماد کچھ دیر اس کی ہی باتیں کرتا رہا۔

"سنو خرم! تمہارے مانچسٹر والے نئے ہوٹل کی جب اوپننگ سیریمنی ہو گی تو اس کا چیف گیسٹ کون ہو گا؟" وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگا۔

"شیخ جہانگیر۔" میں مسکرایا۔

☆ ☆ ☆

وہ میرا سب سے بڑا پروجیکٹ تھا۔ میرا پچھترواں ہوٹل سب سے زیادہ بڑا اور خوب صورت تھا۔

مانچسٹر کے باسی مسلسل بیس گھنٹے سے جاری برف باری سے لاتعلق اپنے روزمرہ کے کاموں میں مگن تھے۔ پورا شہر سفید چاندی سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ اسی یخ بستہ شام کو میرے ہوٹل کا افتتاح تھا۔

صحافی، نقاد، مانچسٹر کا میئر، پاکستانی کمیونٹی کے کچھ جاننے والے احباب اور سب سے بڑھ کر عماد کی پوری فیملی مدعو تھی۔ مہمان خصوصی شیخ جہانگیر تھے۔

بلیک ڈنر جیکٹ میں ملبوس میں مہمانوں کو ویلکم کر رہا تھا۔ گردن موڑ کر میں نے عماد کو دیکھا۔ فیڈڈ بلیو جینز کے اوپر گرے ہائی نیک پہنے وہ ہمیشہ کی طرح اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ تیئس سال کا تھا، مگر میرے لیے وہی اٹھارہ سالہ ٹین ایجر تھا، جس کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کے آگے تو اب بھی کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ دوسرے کو موقع دیے بغیر ہی بولتا رہتا۔ اس وقت بھی وہ مومنہ اور سجل کو باتوں میں لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی مسلسل چلتی زبان کے

سامنے مومنہ سر ہلا رہی تھی، جبکہ سجل بے بسی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت شیخ جہانگیر مجھے آتے نظر آئے میں انہیں ریسیو کرنے آگے بڑھا۔

ڈنر سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح ہینڈسم اور باوقار لگ رہے تھے۔ وہ تنہا ہی آئے ہوئے تھے، جبکہ ان کو بمع فیملی مدعو کیا گیا تھا۔

مسکراتے ہوئے میں نے ان کے ہاتھ سے "بکے" لیا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد میں نے ان سے اکیلے آنے کا سبب دریافت کیا۔

"میری وائف کو کسی فیشن شو میں شرکت کے لیے کراچی جانا تھا البتہ میری بیٹی کی کوئی فرینڈ آگئی تھی، ورنہ وہ بھی آجاتی۔" ان کے بتانے پر دل ہی دل میں مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں ذہنی طور پر ماہ نور سے ملنے کے لیے تیار نہ تھا۔ حالانکہ اب وہ مجھے پہلے کی طرح بری نہ لگتی تھی، پھر بھی۔

"آپ کی صاحبزادی تشریف نہیں لائیں؟" عماد چھوٹتے ہی ان سے پوچھنے لگا۔

"نہیں، اس کی کوئی فرینڈ آگئی تھی۔ اس لیے نہیں آسکی۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

"خیر، یہ تو بہت پرانا بہانا ہے۔" عماد نے سر ہلا کر معصومیت سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ بولے۔ "میں تمہارے پاس نئے نئے بہانوں کے لیے کورس کرنے آؤں گا۔"

"ان کو بتائیے گا کہ انہیں یہاں بہت مس کیا گیا ہے۔" وہ بغیر شرمندہ ہوئے کہنے لگا۔

"کس نے کیا مس؟" وہ پوچھنے لگے۔

"میں نے اور کس نے کرنا ہے۔" عماد نے فوراً کہا۔

"وہ بھی تمہارا بہت ذکر کرتی ہے۔ اس دن بھی کہہ رہی تھی کہ ڈیڈ، عماد اس وقت تو بہت اچھا بن رہا تھا، ادھر دبئی میں، مگر بعد میں ایک فون کرنے کی بھی زحمت نہیں ہوئی۔" عماد جھینپ کر مسکرا دیا۔ "وہ کیا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔"

"خیر یہ تو بہت پرانا بہانا ہے۔" شیخ جہانگیر ہنستے ہوئے بولے تو عماد کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ پھر پوری تقریب کے دوران دونوں کی نوک جھونک جاری رہی۔

☆ ☆ ☆

"ایک تو پہلے ہی میچ نے مجھے تھکا دیا ہے، اوپر سے تم میرا سر کھانے کے لیے بیٹھے ہو۔"

"ظاہر ہے۔" وہ مزے سے بولا۔ "تم کھانا نہیں کھلاؤ گے تو تمہارا سر ہی کھاؤں گا نا!"

"شش..... " میں نے اسے چپ کرایا اور فائل پر جھک گیا، وہ اس وقت میرے آفس میں موجود تھا۔

"چھوڑو بھئی، مجھے دے دو، تم کچھ نہیں کر سکتے۔" اس نے میرے ہاتھ سے فائل چھین لی اور بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔

"اوں ہوں، دو منٹ کا کام ہے اور تم پچھلے آدھے گھنٹے سے ویلے بیٹھے جھک مار رہے ہو۔" عماد فائل دیکھتے ہوئے بولا۔

"دو منٹ کا کام اب رہ گیا ہے مسٹر! سارا تو میں ختم کر چکا ہوں۔"

"چپ رہو، نامعقول!" اس نے اپنے برٹش اردو لہجے میں کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

"عماد! تمہیں نامعقول کا مطلب بھی پتہ ہے؟"

"نہیں!" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "مجھے تو صبح امی نے کہا تھا، نامعقول، تم کسی کام کے نہیں ہو۔"

"اس کا مطلب ہوتا ہے بے وقوف، ایڈیٹ کم عقل، جس کو تمیز نہ ہو....."

"پھر تو شاید وہ تمہارے لیے کہہ رہی تھیں۔" وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔ "میں ان سے دوبارہ پوچھ لوں گا۔"

"جی نہیں، میں بہت کام کرتا ہوں۔" میں نے فرضی کالر جھاڑے۔

"جس کے لیے کرتے ہو، اس سے شادی کب کرو گے؟" وہ جرح کرنے کے موڈ میں تھا۔

میں نے سر جھکا لیا۔ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"کیا ہوا خرم؟" وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"وہ اب، اب نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ شادی ہو گئی اس کی؟"

"نہیں۔"

"پھر، وہ کسی اور کو پسند کرنے لگی ہے؟"

"نہیں۔"

"وہ کہیں چلی گئی؟"

"ہاں وہ چلی گئی۔"

www.Paksociety.com

"پاکستان سے چلی گئی؟" وہ پریشان سا ہو کر پوچھ رہا تھا۔
"اس دنیا سے چلی گئی۔ خودکشی کرلی اس نے۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں بتایا۔
"کیا کہہ رہے ہو؟ وہ' وہ مرگئی؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
"ہاں۔"
"کب؟" وہ تاسف سے پوچھ رہا تھا۔
"جس روز میں اسے چھوڑ کر گیا تھا اسی دن۔"
کتنی ہی دیر وہ خاموش کھڑا مجھے تکتا رہا۔
"تمہیں کب پتہ چلا۔ یہ سب؟" وہ دھیرے سے بولا۔
"دو برس پہلے ایک کامن فرینڈ سے ملا تھا' اسی نے بتایا تھا۔" میں اپنے لہجے پر قابو پانے کی سعی کرنے لگا۔ میں جان بوجھ کر تفصیلات میں نہیں گیا۔
"خرم! آئی ایم رئیلی سوری ٹو ہیر آل دس۔" وہ چند ثانیے خاموش رہا' پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مگر تم فکر مت کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"
میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک پژمردہ سی مسکان میرے لبوں پر بکھر گئی۔
"چلو' شاپنگ پر چلتے ہیں۔" اس کے اصرار پر میں بھی بوجھل دل کے ساتھ اٹھ آیا۔
ASDA مارکیٹ میں کچھ دیر تو ہم ونڈو شاپنگ کرتے رہے' بالآخر ایک گارمنٹ اسٹور پر عماد کو ایک جیکٹ پسند آگئی۔ ابھی میں جیکٹ میں نقص نکالنے ہی والا تھا کہ میری نگاہ قریب کھڑی اسپینش ناک نقشے والی خاتون پر پڑی۔ وہ ہاتھ میں مفلر پکڑے' عماد کو مسلسل دیکھے جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گہرا تاسف چھلک رہا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے عماد کو تکتی رہی۔ پھر مفلر وہیں رکھ کر ہمارے قریب چلی آئی۔
"ایکسکیوزمی بیٹا!" وہ رسانیت سے بولی۔
"یس میڈم!" عماد نے فوراً" خوش اخلاقی دکھائی۔
"تم کون ہو بیٹا؟" وہ محبت و شفقت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"میں' میں عماد ہوں۔ عماد احمد۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولا۔
"تم' تم بالکل رکارڈو کی طرح ہو۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"کون رکارڈو؟" عماد پوچھنے لگا۔
"میرا بیٹا' رکارڈو' تم اسی کی طرح خوب صورت اور قدر آور ہو' تمہارے بال بھی بالکل اس جیسے ہیں اور آنکھیں بھی۔ میں نے جب' تمہیں دیکھا تو یوں لگا کہ شاید میرا رکی کھڑا ہے۔ میں سمجھی وہ' وہ واپس آگیا ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
عماد نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے شانے اچکا دیے۔
"آپ کا بیٹا کہاں ہوتا ہے؟" عماد اس عورت سے پوچھنے لگا۔
"وہ' وہ نیویارک میں ہوتا تھا۔ 11 ستمبر کو اپنے دوست سے ملنے ٹوئن ٹاورز گیا تھا۔ پھر' پھر وہاں اٹیک ہوگیا۔ رکی واپس نہ آیا۔ وہاں کچھ بھی نہ بچا کوئی بھی واپس نہ آیا۔" اس کی آنکھیں اب جھلملانے لگی تھیں۔ "آج تمہیں دیکھ کر یوں لگا کہ شاید رکی واپس آگیا ہو۔ مجھے لگا' ابھی تم آؤ گے اور مجھے کہو گے' ممی میں آگیا ہوں۔ ممی آپ کا رکی آگیا ہے۔ مگر تم تو' تم تو رکی نہیں ہو۔ تم تو عماد ہو' وہ' وہ اب کبھی بھی واپس نہیں آئے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔
میری طرح عماد بھی پریشان ہوگیا تھا۔
"اگر میں آپ کے لیے کچھ کرسکوں میم؟" وہ خلوص سے بولا۔
"نہیں' تم کیا کرسکتے ہو' سوری میں نے تمہارا ٹائم لیا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی تھی۔
"پھر بھی؟" وہ بضد تھا۔
"بس ایک احسان کردو مجھ پر! جب میں جانے لگوں تو دایاں ہاتھ ہلا کر صرف ایک دفعہ مجھے "بائے ممی" کہہ کر پکارنا' بالکل اس طرح جیسے رکی پکارتا تھا۔ آنے والے دنوں میں مجھے حوصلہ ملتا رہے گا۔ ایک امید سی بندھی رہے گی کہ وہ ان فضاؤں میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ پلیز!" وہ ملتجی لہجے میں بولی تو عماد نے فوراً" سر ہلا دیا۔
وہ عورت کاؤنٹر پر گئی' سیلز مین سے کچھ کہا اور اپنے شاپر زاٹھا کر داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔
"ممی!" عماد نے زور سے پکارا "بائے ممی!"
اس اسپینش عورت نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں دوبارہ ایک چمک سی پیدا ہوئی تھی' مگر اس دفعہ یہ آنسوؤں کی نہیں تفاخر اور تسخیر کی تھی۔ اس نے عماد کی طرف ہاتھ ہلایا اور باہر نکل گئی۔
عماد خاموشی سے کھڑا اپنے جوتوں کو تکتا رہا۔ اس نے

اس عورت کی باتوں کا زیادہ ہی اثر لے لیا تھا۔
"عماد چلیں؟" میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا دیا۔ جیکٹ لے کر ہم کاؤنٹر پر پہنچے۔ وہ ابھی تک سوچوں میں گم تھا۔ اس کے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب سیلز مین نے اسے بل تھمایا۔ بل پڑھتے ہوئے وہ چونک پڑا۔
"ڈیڑھ سو پاؤنڈز؟ آر یو کریزی؟" یہ جیکٹ تو محض 50 پاؤنڈز کی ہے اور یہ باقی اشیاء کیوں لکھی ہیں' یہ تو میں نے نہیں خریدیں۔"
"سر! یہ ان میڈم کا بل ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے گئی ہیں۔"
"لیکن میں اس کا بل کیوں پے کروں؟"
"وہ کہہ رہی تھیں یہ لڑکا میرا بیٹا ہے' یہ میرا بل ادا کرے گا۔"
"لیکن وہ میری مدر تو نہیں تھی۔" عماد چلایا۔
"لیکن سر! آپ نے خود ہی تو اتنی اونچی آواز میں انہیں بائے ممی کہا تھا۔" سیلز مین اب حیران سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"لیکن وہ تو....." عماد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جواباً" زور کا قہقہہ لگایا۔ کیا کمال اداکاری کی تھی اس نے۔ چار و ناچار عماد نے بل بھر دیا۔ واپسی پر سارا راستہ اس کا موڈ خراب رہا۔
میرا کاروبار بے حد ترقی کررہا تھا۔ اور اب میرے ہوٹل دنیا کے کئی ممالک میں موجود تھے۔ ان ملک کے تقریباً" ہر بڑے شہر میں موجود تھے۔ اور میں' خرم زید' اب تھک چکا تھا۔
میں کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچ گیا تھا؟۔
کال سینٹر پر ٹیلی فون آپریٹر اور ایک عالیشان ہوٹل پر ایک معمولی سے بیرے سے شروع ہو کر میں انگلینڈ کے گنے چنے طاقتور ہوٹیلیئرز میں سے ایک بن چکا تھا۔ جتنا میں نے چاہا تھا' اس سے کہیں زیادہ مجھے مل گیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں؟ یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟ کامیابی کی طرف یا تباہی کی طرف؟ نجانے کب مجھے ٹھوکر لگے گی' کب میں گر پڑوں' کب پلٹ آؤں؟ یہ اندھی سڑک کہاں جارہی تھی' مجھے نہیں معلوم تھا۔
کبھی کبھی اگر رات کو کوئی لمحہ مجھے فارغ مل جاتا تو میں کھڑکی کھول کر سیاہ آسمان پر ہنستے مسکراتے چاند کو دیکھتا۔ کبھی وہ مجھے بہت حسین لگتا' کبھی بہت بدصورت' اس کے اندر ایک بدصورتی تھی جسے سورج سے چرائی گئی روشنی خوب صورتی بخش رہی تھی۔ مایوس ہو کر میں کھڑکی بند کر دیتا اور سوچتا کہ میں کہاں جارہا ہوں؟ اگر میں دس ہزار ہوٹلز بھی بنالوں' بل گیٹس سے بھی زیادہ امیر ہو جاؤں تو پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ کیا سمل واپس آجائے گی؟ کیا دنیا کی کوئی طاقت سمل کو واپس لاسکتی ہے؟ پھر کیا فائدہ اس دولت کا جو کسی کو اس کا سچا پیار نہ لوٹا سکے؟
کیا مجھے سمل واپس مل جائے گی؟ کیا مجھے کوئی اور لڑکی ملے گی جو اس جیسی ہو؟ شاید کوئی بہت خوب صورت لڑکی مجھے مل جائے تب بھی وہ سمل تو نہیں ہوگی؟ وہ سمل کی طرح مسکرائے گی بھی نہیں' وہ سمل کی طرح روئے گی بھی نہیں۔ کوئی بھی لڑکی وہ نہیں ہوسکتی جو سمل تھی! اس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ وہ بس ایک تھی! صرف ایک'
اگر میرے پاس اس کی یادیں' اس کا احساس اور خیال نہ ہوتا' اگر میرے دل میں اس کے آنسو اور مسکراہٹیں محفوظ نہ ہوتیں' میرے لاشعور میں وہ معصوم سی لڑکی نہ بستی ہوتی' تو میں جی نہ پاتا۔
یہ سمل کا تصور تھا جو مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ اس کی گہری آنکھیں تھیں' جو میری ہر کامیابی کو دیکھتی تھیں' یہ اس کی محبت کے جگنو تھے جو اس تاریک راہ پر مجھے راستہ دکھاتے تھے! وہ کبھی بھی میری زندگی سے نہیں نکلی تھی۔ وہ میرے ساتھ تھی' ہر لمحہ' ہر پل۔

☆ ☆ ☆

مومنہ شادی کے بعد شارجہ جبکہ سونیا لاہور چلی گئی تھی۔ سجل کے لیے میرے شیڈول میں سے وقت نکالنا بہت مشکل تھا۔ سو وہ بھی لاہور چلی گئی اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کرنے لگی۔
میری راتیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ نیند کی گولیوں کے بغیر میں سو نہیں سکتا تھا۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے ہوٹلز چلا جاتا۔ مانچسٹر میں' میں کم ہی ہوتا تھا۔ زیادہ تر ملک سے باہر رہتا تھا' اور لیڈز گئے ہوئے تو تین چار سال ہو ہی گئے تھے۔
اس رات مجھے اپنے پرانے شہر کی بہت یاد آئی۔ ایسی یاد

اسلام آباد کی بھی آتی تھی، مگر وہاں تلخ یادیں بھی تھیں۔ نجانے کیوں میں نے پاکستان میں کوئی ہوٹل نہیں بنایا تھا نہ ہی کبھی واپس جانے کا سوچا۔

میں اسی رات لیڈز آگیا۔ ایئرپورٹ سے سیدھا ہوٹل پہنچا اور تقریباً" نصف گھنٹے بعد گاڑی اڑاتا ہوا ویسٹ برج کی جانب گامزن تھا۔

"ویسٹ برج" پر میں اپنی بہت سی یادیں چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک اسٹی ٹیوٹ کی مانند تھا، جہاں صرف ایک سال گزار کر میں نے بہت تجربہ حاصل کیا تھا۔

مجھے آج بھی وہ شب و روز یاد تھے جب میں وہاں ڈیوٹی منیجر تھا۔ ہوٹل میں میرا اپنا کمرہ تھا، لیکن میں سب کچھ لاؤنج میں بیٹھ کر کیا کرتا۔ دوپہر کو ریسٹورنٹ کے کچن کی تیاری کے لیے آلو، گاجر اور بند گوبھی کاٹا کرتا تھا۔ اگر عماد آجاتا تو ہم جلدی آلو کاٹنے کا مقابلہ کرتے۔

عماد سے ملے بھی سال ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار انٹرنیٹ پر بات ہو جاتی، اتفاق سے اگر ہم دونوں آن لائن ہوتے تو چیٹ ہو جاتی ورنہ سوائے چند ایک "فارورڈ میلز" کے میں نے اسے کافی عرصے سے کوئی ای میل بھی نہیں کی تھی کبھی اس کا فون آگیا یا میں نے کال کرلی تو ٹھیک ورنہ تو اس کی شکل دیکھے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

وہ اب ویسٹ برج سنبھالتا تھا۔ صفوان، شارجہ میں ہوتا تھا۔ اس کی تو شادی بھی ہو گئی تھی اور دو یا تین بچے بھی تھے۔ البتہ عماد سے میں جب بھی شادی کا کہتا، تو وہ سر جھٹک کر جواب دیتا "لڑکیاں تو سر کا درد ہوتی ہیں۔"

وہ اپنے آفس میں بیٹھا فون پر محو گفتگو تھا جب میں بغیر دستک کے اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً" فون رکھ دیا اور میرے سینے سے لگ گیا۔

"کب آئے تم؟" وہ خوشگوار حیرت سے پوچھنے لگا۔

"بالکل ابھی!" میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"خیریت، اتنے عرصے بعد ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"بس! لیڈز والوں کی یاد آرہی تھی، سوچا شکل ہی دکھا دوں تم تو ملتے ہی نہیں، میں ہی آجاؤں۔"

"واہ! کیا خوب کہی۔ تم تو جیسے روز ڈنر میرے ساتھ کرتے ہو نا!" وہ تڑخ سے بولا۔

"اب آتو گیا ہوں یار!" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"اچھا بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟" وہ سدا کا مہمان نواز، پوچھنے لگا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کھانا کھا کر آرہا ہوں۔ سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں!" وہ ہیرے سے بولا۔

"اور سناؤ فریا کیسی ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"ٹھیک ہے۔ کل میری بات ہوئی تھی اس سے، اپنے ہزبینڈ کے لیے رشین سیلڈ بنا رہی تھی۔ وہ لوگ دو روز تک انگلینڈ آرہے ہیں۔"

"ویٹس گڈ!"

پھر کافی دیر ہم فضول گپیں ہانکتے رہے۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد میری گاڑی لیڈز کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

ہر گزرتی سڑک کے ساتھ نجانے کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے زندگی کے تین سال اس شہر میں گزارے تھے اور مانچسٹر میں اس سے دگنا عرصہ گزارا تھا، مگر لیڈز میں گزارے وہ ماہ و سال مجھے یاد تھے۔ مجھے اس شہر کی گلیوں اور مکانوں میں اپنا عکس، اپنا ماضی نظر آرہا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پچھلے چھ برس بیچ میں ہی کہیں رہ گئے ہوں۔

میں تو یہاں سے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ اس جگہ میں اپنا بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔

جب تک میں یہاں تھا، یہی سمجھتا رہا کہ وہ زندہ ہے اور اس کے لیے محنت کرتا رہا۔ بعد میں لندن جا کر اصل حقیقت کا علم ہوا، اس کے بعد گزرنے والے روز و شب وقت کی دھول میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔

نہ جانے وہ برس کہاں بیتے تھے؟ بلکہ وہ تو شاید میری زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔ میرا دل تو ابھی چھ سال پیچھے تھا، اس گھڑی سے آگے بڑھا ہی نہیں تھا۔

"لیڈز جنرل انسرمری۔" کو دیکھ کر مجھے 1997ء کی سردیوں کے وہ دن یاد آگئے جب چیسٹ انفیکشن کے باعث میں دو روز تک اس ہسپتال میں داخل رہا تھا۔

وارنر وچ سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے ذہن کے پردے پر وہ دن نمودار ہوا جب میں، عماد، عمر، صفوان اور حیدر "ٹائی ٹینک" دیکھنے کے لیے یہاں آئے تھے اور واپسی پر عماد اور عمر کی زبردست لڑائی ہوئی تھی.....

ہیڈنگلی کرکٹ اسٹیڈیم کے قریب جا کر بے اختیار مجھے پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان کھیلا گیا وہ کرکٹ میچ یاد آگیا

دیکھنے کے لیے میں نے عماد کو فون کر کے ہوٹل بلا لیا اور خود اسٹیڈیم جا پہنچا، مگر عماد خود بھی وہیں بیٹھا میچ دیکھ رہا تھا..... موریسن مارکیٹ اور ASDA شاپنگ مال سے فریا کی شادی کے لیے گھنٹوں ہم نے شاپنگ کی تھی۔

ہیئر ہلز کے کارنر پر ایک پاکستانی کی دکان سے ہم اکثر پلن تکہ یا پکوڑے کھایا کرتے تھے.....

میں کیا کیا یاد کرتا؟ اس شہر کی ہر سڑک، ہر عمارت اور ہر دکان سے کتنی زندگی جھلکتی تھی۔ وہ زندگی جو کبھی میرے اندر ہوتی تھی، جو میرے لہو، میری روح میں شامل تھی۔ وہ جذبہ، وہ جوش اور زندہ دلی جو میری رگوں میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ محبت جو میرے من میں موجود تھی۔ تب میرا دل زندہ تھا، اس کے اندر کسی کی محبت، کسی کو پا لینے کا جذبہ مچلتا تھا، مگر اب وہ ایک ویران گوشے کی مانند تھا، جہاں صرف کھنڈر تھے اب میرے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف میرا دماغ چوبیس گھنٹے کام کرتا، مجھے پیسہ بنانے کی مشین بنائے رکھتا۔

اور پھر میں نے وہ جگہ دیکھ لی۔

میڈم کیرن کا پب۔

میرے قدم خود بخود پب کی جانب اٹھ گئے۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں نو برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ پہلی دفعہ میں یہاں آیا تھا تو مجھ پر حیرت اور خوف کا غلبہ تھا۔ اس دفعہ مجھ پر ایک بے خودی سی طاری تھی۔ ایک عجیب سا احساس مجھے یہاں کھینچ لایا تھا۔

وہ کونے میں رکھی اسی میز پر بیٹھی تھی جہاں کئی برس پہلے ہم بیٹھے تھے۔ اس نے آج بھی گرے بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی شگفتہ اور جوان تھا۔ مجھے دیکھ کر آج بھی وہ مسکرائی تھی۔

میں آرام سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی خرم!" وہ ہولے سے بولی۔

"کب سے؟"

"جس دن سے تم یہاں سے گئے تھے، اس لمحے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے میڈم! وہ مجھے یاد نہیں کرتی، وہ میرے لیے نہیں روتی کیونکہ وہ اس دنیا سے کب کی جا چکی ہے۔ وہ کب کی مجھ سے روٹھ کر یہ کائنات چھوڑ چکی ہے۔ کیا تم جانتی نہیں تھیں، یا مجھ سے حقیقت کو چھپا لیا؟" وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔

"بتاؤ نا میڈم! کیوں کیا تم نے میرے ساتھ اس طرح!"

"اس لیے تو کہتی تھی خرم کہ واپس چلے جاؤ۔ مگر تم نہیں گئے۔ اگر چلے جاتے تو اتنا بوجھ نہ ہوتا تمہارے دل پر۔"

"مگر کیا فائدہ ہوتا واپس جانے کا؟"

"بزنس مین ہو نا! فائدہ نقصان دیکھتے ہو۔"

"کیا فرق پڑتا ہے میڈم! وہ واپس تو نہیں آسکتی نا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"خرم! وقت انسان کو بدل دیتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"مگر میں نہیں بدلا۔"

"میں تمہاری بات نہیں کر رہی۔"

"پھر؟"

"میں اس کی بات کر رہی ہوں۔"

"کس کی؟"

"وہ بہت بدل گئی ہے۔ وہ اب ویسی نہیں رہی، جیسے پہلے تھی۔ وہ تمہارے لیے بدلی ہے، کیونکہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"کون؟" وہ خاموش رہی تو میں خود ہی بول پڑا۔ "ماہ نور۔"

"تم چاہتے تھے شیخ جہانگیر تمہیں داماد کی حیثیت سے قبول کرلیں۔ اب تمہاری خواہش پوری ہو سکتی ہے۔" وہ مسکرائی "اس کی بیٹی سے شادی کر کے۔"

"لیکن وہ تو مر گئی ہے۔"

"ہاں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بہت تکلیف میں مری تھی وہ! ایک عام سے ہسپتال کے چھوٹے سے وارڈ میں، موت کے وقت سوائے بہن کے، کوئی نہیں تھا اس کے پاس۔ لیکن شیخ جہانگیر کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک مر گئی تو دوسری تو زندہ ہے۔"

"میڈم!" میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"جاؤ صبح آفس میں آنے والا پہلا پروزل سائن کر لینا۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا، میں پب سے باہر نکل آیا۔

اسی رات میں مانچسٹر واپس چلا گیا۔

صبح آفس میں سب سے پہلا پرپوزل "القریش انٹرپرائزز" کی جانب سے تھا۔ وہ پاکستان میں ایک سیون اسٹار ہوٹل بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے میرا تعاون درکار تھا۔ 8 اکتوبر کے زلزلے کے پیش نظر مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا' مگر جس کنسٹرکشن کمپنی کو ہائر کیا گیا تھا وہ پاکستان کی مشہور "جہانگیر بلڈرز شیخ" تھی۔ میرے جیسے عقل مند اور ذہین و فطین انسان نے ایک نیم پاگل سائیکک کی بات مانتے ہوئے کنٹریکٹ سائن کر لیا۔

اسی سہ پہر جہانگیر بلڈرز کی چیئرپرسن اور القریش انٹرپرائزز کے چیئرمین کے ساتھ میری میٹنگ لندن میرپٹ میں تھی۔

میں جانتا تھا "جہانگیر بلڈرز" کی چیئرپرسن ماہ نور تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں اس سے ملنے چلا گیا میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مغرور لڑکی بدلی ہے یا نہیں۔

وقت مقررہ سے دس منٹ پہلے ہی میں میٹنگ کے لیے پہنچ گیا۔ قریباً دو منٹ میں نے گھوم پھر کر لاؤنج کا جائزہ لیا۔ جس چیز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا وہ سینٹرل ٹیبل پر رکھے ویزیٹنگ کے نیچے پڑی کتاب تھی۔

ماہ نور اور کتاب؟ یہ ناممکن تھا۔

تو کیا وہ واقعی بدل گئی تھی؟

اس وقت وہ بالکونی میں تھی کیونکہ وہاں کھلنے والا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے اس کا بیگ اٹھا کر نیچے رکھی گئی ہیری پوٹر نکالی۔ یہ ہیری پوٹر کا چھٹا پارٹ تھا۔ ماہ نور نے اس طرح کی کتابیں کب سے پڑھنا شروع کر دیں؟ میں کافی حیران ہوا تھا۔

جس وقت میں کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا' بالکونی کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ایٹی کیٹس کے مطابق مجھے کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہنا تھا' مگر میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکا۔

میں اس لڑکی کے لیے کھڑا ابھی نہ ہو سکا جس سے پچھلے نو برس میں نے بے تحاشا محبت کی تھی.....

میں نے بیساکھی کے سہارے اندر آتی سمل جہانگیر کو سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

☆ ☆ ☆

اس کو بچانے کی ذمہ دار منسٹر آف ہیلتھ کی مسز تھیں۔ اگر ان کی پارٹی کے دوران مسز جہانگیر سے نوک جھونک نہ ہو جاتی اور مسز جہانگیر غصے میں واپس گھر نہ جاتیں اور نہ ہی [illegible] اپنی بڑی بیٹی کو کچن میں تڑپتا ہوا نہ دیکھتیں اور نہ ہی [illegible] اسپتال پہنچا پاتیں۔

پوری دنیا میں خودکشی ایک ایسا جرم ہے' جس میں [illegible] "مجرم" کامیاب ہو جائے تو سزا سے بچ جاتا ہے اور اگر ناکام ہو جائے تو اسے قانوناً" اور اصولاً" سزا ملتی ہے۔

مگر قانون اور اصول سینئر جہانگیر پر لاگو نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ جس ہسپتال میں اسے لایا گیا تھا' وہ شیخ [illegible] کا تھا۔

جس اے ایس پی کی اس کیس پر ڈیوٹی لگی تھی' اس کا چھوٹا بھائی شیخ جہانگیر کی کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتا تھا۔

اور شیخ جہانگیر اس وقت سینیٹ کے سب سے [illegible] سینیٹر تھے۔ اسی لیے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ویسے بھی کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شیخ جہانگیر کو چیلنج کر سکے اس لیے یہ بات کسی کے منہ پر نہ آئی کہ جہانگیر کی بیٹی نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔

☆ ☆ ☆

سمل نے اپنے بھاری پپوٹے اٹھائے تو نگاہ کے سامنے مما کا دھندلا سا چہرہ دکھائی دیا۔ ان کی دھیمی سی پکار اس کی سماعت سے ٹکرائی' مگر وہ اتنی ہلکی تھی کہ وہ بمشکل ہی سن پائی۔ پھر ان کا چہرہ دھیرے دھیرے دھند میں گم ہو گیا۔

دوبارہ جب اس کی آنکھوں کے دریچے وا ہوئے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ مرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی کھڑکی کے ادھ کھلے پردے سے چھن کر آتی چاند کی دھیمی دھیمی چاندنی نے ماحول کو بہت سحر انگیز بنا دیا تھا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں تو منظر قدرے بہتر ہو گیا۔ یہ ہسپتال کا ایک وسیع اور کافی کھلا سا پرائیویٹ روم تھا۔ سر گھما کر اس نے اپنے بائیں جانب لگی ڈرپ کو دیکھا' جس کا "کینولا" اس کے جسم میں شاید تھوڑی دیر پہلے تک لگا ہوا تھا۔ شاید پہلے اسے ڈرپ لگی ہوئی ہو' مگر اس وقت تک اتر چکی تھی۔

سائیڈ ٹیبل پر سرخ گلابوں کا ایک بہت خوب صورت گلدستہ رکھا تھا۔ سامنے پڑی میز پر ڈھیر سارے گفٹس اور پھول رکھے تھے۔ دائیں جانب کاؤچ پر کوئی نیم دراز تھا جسے وہ گردن نہ موڑ سکنے اور نیم تاریک ماحول کی وجہ سے دیکھ نہ پائی تھی۔

"یہ اس جگہ کیوں تھی؟" وہ ذہن پر زور دینے لگی۔

وہ تو اپنی لائبریری میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی' جب کوئی آیا تھا؟ کون آیا تھا؟ وہ سوچنے لگی..... شاید صوفیہ اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر صوفیہ کون تھی؟ اور اختر کون تھا؟

نہیں صوفیہ اور اختر تو اس کتاب میں تھے۔ جو وہ پڑھ رہی تھی۔

"کیا نام تھا اس کا؟" اس کو ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا۔

پھر اندر کون داخل ہوا تھا؟

مما' مما اندر داخل ہوئی تھیں اور کیا کہا تھا انہوں نے؟

ہاں' اسے کچھ یاد آیا' انہوں نے اسے پارک میں چلنے کو کہا تھا' پھر راستے میں ہی کچھ ہو گیا اور وہ یہاں پہنچ گئی۔ شاید ایسے ہی تھا۔

نہیں..... بیچ میں کچھ مسنگ تھا۔ مما اسے پارک لے کر گئیں اور وہ یہاں آ گئی۔ ان دونوں واقعات کے درمیان کچھ اور بھی ہوا تھا کیا ہوا تھا؟

اور پھر بہت اچانک سے اسے یاد آیا۔ وہ سفید پھول جو اسے پارک میں کسی بچے نے لا کر دیا تھا اسے یاد آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی باقی سب کچھ بھی الٹ کر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

کیونکہ اسے سمل سے نہیں' اس کی دولت سے محبت تھی۔ خرم کی نگاہ سمل کے باپ کی اربوں کی جائیداد پر تھی' جو اس سے شادی کی صورت میں اسے مل سکتی تھی۔

لیکن کیا سمل اتنی بے وقعت تھی کہ وہ اسے یوں چھوڑ کر چلا گیا؟

"تو خرم زید' تمہاری محبت تو محض ناٹک نکلی' تمہارا پیار دھوکا نکلا۔ لیکن وہ محبت جو میں نے تم سے کی تھی' وہ سچی اور بے لوث محبت تھی۔

تم کچھ تو کہتے خرم! اپنے اس طرح جانے کی وجہ ہی بیان کر دیتے! لیکن تمہارے اس طرح جانے کی ایک ہی وجہ ہے' کہ تمہارے نزدیک میری کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہارے دل میں میری حیثیت ایک عام اور معمولی لڑکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تم تو میرا سب کچھ لوٹ کر لے گئے میرے خواب' میرے جگنو۔

"کم صورتی اور معذوری کسی کو معمولی اور غیر اہم نہیں بنا دیتی" یہ بات تم نے ہی کہی تھی۔ یہ سبق بھی تم نے ہی مجھے دیا تھا کہ "دنیا سے لڑنا سیکھو' ثابت کرو کہ تم اہم ہو۔"

"کیا میں اسے بھلا پاؤں گی؟" رات کے اس پہر سمل جہانگیر نے خود سے سوال کیا تھا۔

صبح ہونے کے قریب' اسپتال کے اس پرائیویٹ روم کے بستر پر لیٹی سمل جہانگیر نے خود سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس دنیا پر یہ ثابت کرے گی کہ وہ کم ہمت' بزدل اور معمولی لڑکی نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

پانچ روز بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔

وہ گھر آتے ہی بنا کسی سے بات کیے' اپنے کمرے میں چلی گئی۔

الماری سے ایک عام سا کاٹن کا سوٹ نکال کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھی ہی تھی کہ یاد ماضی سے اس کی آواز نکل کر سمل کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ جو تمہارا حلیہ ہے' یہ ایک لڑکی کا حلیہ نہیں ہوتا۔"

سمل نے بغور اس سبز کاٹن کے جوڑے کو دیکھا کیا کوئی باذوق لڑکی اس طرح کے فضول کپڑے پہنے گی؟"

جواب نفی میں تھا۔

اس نے اپنی وارڈ روب کھول کر تمام کپڑوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔

میرون' براؤن' گرے' سیاہ' ڈارک پرپل اور نیوی بلیو بس یہی کلرز تھے اس کے زیر استعمال کپڑوں میں۔

"تم کوئی عام سی لڑکی نہیں ہو جو عام سے لباس میں رہو۔ خود اپنے آپ کو خاص اور اہم فیل کرو گی تو لوگ تمہیں "اہم" جانیں گے۔"

اس نے دوسری الماری کھولی۔ مما اکثر و بیشتر اس کے لیے کپڑے لاتی تھیں جنہیں اس نے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ خرم کیوں اسے صحیح طور پر ڈریس اپ ہونے کے لیے کہتا تھا؟ وہ صرف بیس برس کی تھی' جبکہ اس کے وارڈ روب کی کلر اسکیم پچاس سال کی معمر خاتون والی تھی۔

اس نے مما کا خریدا ہوا ایک خوب صورت اور اسٹائلش پنک اور وائٹ کلر کا سوٹ زیب تن کیا' ماہ نور کے لائے گئے نازک سے جوتے پہنے' اسلام آباد کے موسم کی مناسبت سے لائٹ پنک سوئیٹر پہنا' بال برش کیے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ پورچ کی جانب تھا۔

"رحیم!" اس نے ڈرائیور کو آواز دی "گاڑی نکالو' مجھے